حقیقت کی تلاش

وحید الدین خاں

حقیقت کی تلاش

وحید الدین خاں (انڈیا)

احباب پبلی کیشنز

۴۳۔ اے ریٹی گن روڈ ــــ لاہور

ناشر : احباب پبلیکیشنز
۴۳ - اے ریٹی گن روڈ - لاہور

مطبع : محبوب پرنٹنگ کارپوریشن ۹ سرکلر روڈ لاہور

بار اوّل : ایک ہزار

قیمت : ۳/۵۰ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حق کی تلاش

چاند پر انسان کا پہونچنا اور فضا میں اسٹیشن (Skylab) کا قیام یقیناً سائنس کے حیرت انگیز کارنامے ہیں۔ جن پر آج کا انسان جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ وہ بجا طور پر کہہ سکتا ہے کہ آج ہم نے ترقی کے وہ منازل طے کیے ہیں جن کو ماضی کا انسان سوچ بھی نہیں سکتا تھا ــــ کیا انسان کا یہ دعویٰ صحیح ہے ؟ کیا انسان واقعی ترقی کر رہا ہے ؟ ــ جس انسان کے عیش و آرام کے لیے یہ سارا انتظام کیا جا رہا ہے وہ تو دن بدن گرتا جا رہا ہے۔ جھوٹ، بے ایمانی، مکاری، رشوت ظلم وبا کی شکل میں معاشرہ کے اندر پھیل رہے ہیں۔ امیر اور غریب، عالم اور جاہل افراد اور جماعتیں سب کے سب اس حمام میں ننگے ہی ہیں۔ آج کا انسان اگر مادی حیثیت سے آسمان پر پہونچا ہوا ہے تو اخلاقی حیثیت سے تحت الثریٰ میں گرا ہوا ہے۔ زندگی کا یہ تضاد روز روشن کی طرح ہر خاص و عام پر عیاں ہے۔ مادی ترقی کا اصل مقصود تو یہی انسان تھا۔ لیکن آج مادی ترقی بذات خود مقصود بن گئی ہے۔ اس لیے اس حیرت انگیز ترقی کے باوجود بے چارے انسان کو امن و سکون نہ مل سکا۔ انسان آج بھی ننگا اور بھوکا ہے۔ افراد اور جماعتیں آج بھی انصاف کو ترس رہی ہیں۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا جنگلی قانون

ہر طرف چل رہا ہے۔ مغربی قومیں سائنس اور ٹکنالوجی میں تو ضرور آگے بڑھیں مگر ان کے پاس وہ صحت مند قدریں (Values) نہیں ہیں جو حیات انسانی کی متوازن ترقی کے لیے ضروری ہیں چنانچہ صحت مند قدروں کے بغیر ہی وہ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں بڑھتی چلی گئیں اور اب وہ نہ صرف پوری دنیا کے لیے بلکہ خود اپنے وجود کے لیے خطرہ بن گئی ہیں چنانچہ سید قطب شہیدؒ نے اسی خطرہ کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

"زندگی کے موجودہ خطوط کبھی نہ کبھی انسانی خصوصیات کو تباہ کر کے انسان کو مشین اور حیوان بنا دیں گے۔"

(اسلام اور مغربی تہذیبی مسائل صفحہ ۱)

مصنّف مذکور نے اپنی ایک دوسری کتاب میں یہی بات کہی ہے:۔

"فضا میں چھوڑے جانے والے راکٹ اور مصنوعی سیارے ہمیں اس قعرِ مذلت سے غافل نہ کریں جس میں انسان اور اس کی بنائی ہوئی اقدار گر رہی ہیں"

(اسلام کا روشن مستقبل صفحہ ۵۹)

اسی کتاب کے صفحہ ۶ پر لکھتے ہیں:۔

"سائنس نے روحِ انسانی کے تقاضوں کو بالکل نظر انداز کر کے مادّی اور تمدّنی زندگی کے لیے جو سہولتیں فراہم کی ہیں ان میں سے کوئی بھی اس انحطاط کا دھارا نہیں بدل سکتی جس میں پوری نوعِ انسانی اس وقت گرفتار ہے۔ وہ اس بدبختی اور ہلاکت کا درماں نہیں بن سکتی جو انسان پر عذاب بن کر مسلط ہو رہی ہے۔"

کلیسا کا رول

ان مایوس کن حالات میں مذہب ہی کی طرف نگاہ اٹھتی ہے کہ وہاں سے شاید انسانیت کی فلاح کی کوئی راہ نکل سکے۔ لیکن کلیسا کا حال اس سلسلہ میں بالکل ہی مایوس کن ہے۔ جس کی (ST. Jarune) نے بالکل صحیح تصویر کھینچی ہے:۔

"اہل کلیسا کے تعیش کے سامنے امراء اور دولت مندوں کی عیش و عشرت بھی شرماتی ہے ..... جنت کے قبالے جائداد کی معمولی دستاویزوں کی طرح، مغفرت کے پروانے، نقضِ قانون کے اجازت نامے، اور نجات کے سرٹیفکٹ، بے تکلّف بکتے تھے۔

(اسلام کا روشن مستقبل صفحہ ۱۴)

ایک طرف ان کے اندر اس حد تک بگاڑ آچکا تھا۔ دوسری طرف تمام جغرافیائی، تاریخی، اور طبعی معلومات جو لوگوں میں مشہور تھیں یا ان کی کتابوں کی شرح اور تفسیر میں ان کا تذکرہ موجود تھا، مقدّس مان لی گئیں اور ان کو بھی مذہبی رنگ دے کر مسیحی تعلیمات میں شامل کر لیا گیا۔ اور ایک مسیحی کے لیے ان اوہام و خرافات پر بھی ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا۔ ان موضوعات پر کتابیں تصنیف کی گئیں اور ان کا نام جغرافیۂ مسیحی (Christian Geography) رکھ دیا گیا اور ان کو تسلیم نہ کرنا کفر قرار دیا گیا:۔

"علمی تحقیق کے نتیجہ میں نئے نئے فلکی، جغرافیائی، اور طبعی حقائق سامنے آئے جو اس مجموعۂ اوہام، دیو مالا، اور خرافات کے برعکس تھے جن کو کلیسا نے اپنایا ہوا تھا۔ اور جنہیں وہ مقدّس بتاتا تھا۔ حالانکہ ان خرافات کا عیسائی مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ اس زمانہ کے لوگوں میں پھیلے ہوئے غیر علمی افکار تھے۔

اللہ کے نازل کردہ نہیں تھے۔ انہیں انکار کو کلیسا نے اپنا لیا اور اس طرح ان کی مدافعت کرنے لگا جیسے یہ بھی عقیدہ کا ایک جز ہوں"
(اسلام اور مذہبی تہذیبی مسائل صفحہ ۴۴)

یہی نہیں کہ ان خرافات کی اہل کلیسا نے سختی سے مدافعت کی بلکہ مخالفین کو نہایت ہی وحشیانہ سزائیں بھی دیں۔

"جن لوگوں کو سزا دی گئی ان کی تعداد تین لاکھ (300.000) سے کم نہیں ہے۔ جن میں سے بتیس ہزار (32000) کو زندہ جلا دیا گیا۔ زندہ جلائے جانے والوں میں ہیئت اور طبیعات کا مشہور عالم برونو (Bruno) بھی ہے جس کا سب سے بڑا جرم کلیسا کے نزدیک یہ تھا کہ وہ اس کرۂ ارض کے علاوہ دوسری دنیاؤں اور آبادیوں کا بھی قائل تھا...... اس طرح مشہور طبعی عالم گلیلیو (Gallilio) کو بھی اسی بنا پر موت کی سزا دی گئی کہ وہ آفتاب کے گرد زمین کے گھومنے کا قائل تھا۔"
(اسلام کا روشن مستقبل صفحہ ۴۹-۵۰)

کلیسا کی ان وحشت اور بربریت کا فطری نتیجہ یہی ہوتا تھا کہ دونوں گروہوں کے درمیان تلخی کی ایک گہری خلیج حائل ہو جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ آگے چل کر سائنس اور مذہب ایک دوسرے کی ضد تسلیم کر لیے گئے۔ سائنس دانوں کے دل میں مسیحی مذہب کے خلاف جو نفرت اور عداوت پیدا ہو گئی تھی وہ آگے چل کر رفتہ رفتہ مطلق مذہب کے خلاف پیدا ہو گئی۔ اور مذہب سے متعلق عقائد، اخلاق، آداب وغیرہ سب سے نفرت پیدا ہو گئی۔

"روشن خیالی اور عقلیت کے علمبرداروں نے بطور خود یہ طے کر لیا

کہ علم و مذہب ایک دوسرے کی ضد اور مقابل واقع ہوئے ہیں جو کبھی جمع نہیں ہو سکتے اور دونوں ایک دوسرے کے رقیب اور حریف ہیں جن میں کبھی صلح نہیں ہو سکتی"

(اسلام کا روشن مستقبل صفحہ ۴۹)

ڈارون کا نظریۂ ارتقا (EVOLUTION)

کلیسا اور سائنسدانوں کی مخالفت اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ مذہب اور خدا کا تصوّر بھی مخالفت کی زد میں آگیا۔ اور مذہب کے سارے معتقدات سائنسدانوں کے نزدیک ڈھکوسلا قرار پائے۔ سائنسی ذرائع کے استعمال سے ایسے بے شمار مخفی حقائق انسان کے علم میں آئے جن کو وہ اس سے پہلے نہیں جان سکتا تھا تو سمجھ لیا گیا کہ سائنس نے انسانی حواس کی محدودیتوں کی تلافی کردی اور اب ہر موجود چیز کو انسان کے براہ راست مشاہدہ میں آجانا چاہیے۔ سائنسی ذرائع کے استعمال کے بعد بھی اگر کوئی چیز ہمارے مشاہدہ میں نہیں آتی تو یہی ہو سکتا ہے کہ اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ ان آلات کے ذریعہ چھوٹے سے چھوٹے کیڑے اور دور دراز تاروں کو دیکھنے میں کامیابی حاصل ہوگئی ہے۔ لیکن مذہبی حقائق کا مشاہدہ نہ ہو سکا۔ تو یہ سمجھ لیا گیا کہ ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور سائنسدانوں کو پورا یقین ہوگیا کہ مذہبی معتقدات مثلاً خدا، دوزخ، جنت وغیرہ محض فراڈ ہیں —— یہ تھا وہ ذہن جس کو لے کر ہمارا سائنسداں طبقہ میدان عمل میں داخل ہوا تو دیکھتا ہے کہ ایک طرف ایک خلیہ (cell) کا پودا ہے جو اس پودے سے متعلق زندگی کے سارے

کام انجام دے رہا ہے تو دوسری طرف بڑے بڑے پودے تنہ، ڈالیاں، پھل پھول لیے ہوئے کھڑے ہیں ان دو انتہاؤں کے درمیان مختلف قسم کے پودے بے نظیر ترتیب کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح جانوروں میں ایک طرف امیبا (Amoeba) جو صرف ایک خلیہ (Cell) کا جانور ہے مگر وہی ایک خلیہ زندگی کے سارے کام انجام دے رہا ہے۔ تو دوسری طرف انسان اپنی بے انتہا پیچیدہ تخلیق کے ساتھ موجود ہے۔ ان دو انتہاؤں کے درمیان بہت سے جانور بے نظیر ترتیب کے ساتھ پائے جاتے ہیں ـــ یہ مختلف قسم کے پودے اور جانور کیسے وجود میں آ گئے؟ ــ سائنسدان خدا کا انکار کر چکا تھا۔ اور خدا کو مانے بغیر ان چیزوں کی توجیہ ممکن نہ تھی۔ بقول مولانا مودودی کے "الحاد کو پاؤں کے بغیر چلا رہا تھا۔"

"مغرب کی نشاۃ ثانیہ کے دور سے موجودہ سائنس جن لوگوں کے ہاتھوں نشوونما پا رہی ہے ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ اس کارخانہ ہستی میں کسی فوق الفطرت ذات (Super-Natural) کی کارفرمائی و کاریگری ماننے اور محسوس کرنے سے جس طرح بھی بن پڑے پہلو بچائیں۔

(تفہیمات حصہ دوم صفحہ ۲۲۷)

سائنسداں سخت الجھن میں پڑے ہوئے تھے۔ خدا کا انکار کر چکے تھے اس لیے ان کی یہی کوشش تھی کہ دنیا کے اندر ہی کارفرما قوت کا بھی پتہ چل جائے چنانچہ ڈاروِن میدان میں آئے اور ان الجھنوں کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی اس نے کہا کہ مادّہ موجود تھا۔ الٹ پھیر سے اس میں جان پیدا ہو گئی۔ ان میں ارتقاء شروع ہوا اور ماحول کے دباؤ سے ان میں طرح طرح کی صفات پیدا ہوئیں

ان میں سے جو ماحول کے مطابق اپنے اندر تبدیلی کرتا گیا آگے بڑھتا گیا اور جو ماحول کے دباؤ کی تاب نہ لاسکا پیچھے رہ گیا۔ اسی کش مکش کو وہ (Struggle for Existance) کہتا ہے۔ یہ کش مکش کا عمل آج بھی ہو رہا ہے اور نئے پودے اور جانور وجود میں آتے جارہے ہیں۔

"زمین پر زندگی اور شعور پیدا ہونے کی جس میکانیکی (Mechanical) نظریہ کو ڈارون کے مادہ پرست پیروؤں نے پھیلایا اس کا ماحصل یہ تھا کہ مادہ (Matter) زماں (Time) اور مکاں (Space) تو بنیادی حقیقتیں ہیں جو کچھ بھی پایا جاتا ہے، انہیں پر مبنی ہے۔ شروع شروع میں مادہ ایٹم (Atom) کے علاوہ کچھ نہ تھا جو زماں و مکاں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ خاص طبعی قوانین کے تحت انہیں ایٹم نے زمین کی شکل اختیار کرلی اور انہیں طبعی قوانین کے ایک خاص منزل پر پہونچ کر "زندگی" کا ظہور ہوا ـــــ اس نظریہ کی اہم بات بس یہی ہے کہ زندگی کا ظہور تمام تر ایٹم پر طبعی قوانین کے عمل کا نتیجہ ہے۔"

(Modern Belief part III Page 130)

ان کوششوں کے باوجود اس نظریہ کی خامی اب بھی دماغوں میں الجھن پیدا کرتی رہی کہ بے جان مادہ میں جان کیسے پیدا ہوگئی؟ اسی خامی سے بچنے کے لیے برگ سان (Bergson) نے تخلیقی ارتقا (Creative Evolution) کا نظریہ پیش کیا جس میں حیات متحرک (Vital Impulse) مانا پڑا لارڈ مارگن نے امرجنٹ ارتقا (Imergent Evolution) کا نظریہ پیش کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ ارتقا کا فعل مسلسل نہیں ہوتا بلکہ ایک جست

(Jump) کی شکل میں ہوتا ہے اور ہر جست میں کچھ نئے خواص ایک متعین ترقی کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔

ان تمام کوششوں کے باوجود یہ نظریہ اب تک ثابت نہ ہوسکا۔ جو واقعی سائنٹسٹ تھے انھوں نے نظریۂ ارتقا کو حقیقت کبھی نہیں سمجھا بلکہ اس کو ہمیشہ قیاس ہی کہا۔

"جن لوگوں کو سائنس کی اڑتی ہوئی ہوا لگ گئی ہے وہ اس زور شور سے اس کا ذکر کرتے ہیں گویا حقیقت بے نقاب ہوکر ان کے سامنے آکھڑی ہوئی ہے۔" (تفہیمات حصہ دوم صفحہ ۲۲۸)

اب کچھ سائنسداں ایسے بھی میدان میں آئے ہیں جنھوں نے صاف دل و دماغ کے ساتھ اس نظریہ پر غور کیا تو انھیں بھی حقیقت کا کسی قدر علم ہوگیا ہے۔

"مارگن اور برگ سان دونوں کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ بے جان مادّہ سے زندگی پیدا ہونا کسی طرح نہ فلسفہ کی راہ سے اور نہ سائنس کی راہ سے سمجھ میں آتا ہے۔

(Modern Belief)

برٹرنڈ رسل (Bertrand Russell) کو کہنا پڑا کہ:۔

"آج تک کسی نے نہیں بتایا کہ وہ میکانکی تغیرات کیا ہیں جن سے زندگی پیدا ہوئی ہے"

ڈاکٹر سی۔ ڈی۔ براڈ (DR. c. D. Brod) کا خیال بھی بالکل درست ہے:۔

"A" کے بعد "B" اور "B" کے بعد C آتا ہے۔ لہٰذا چونکہ "C" کا ظہور A کے بعد ہوا اس لیے "C" "A" کی بدلی ہوئی شکل ہے ــــ یہ کوئی منطق نہیں ہے۔ تم کو۔

کہنے کا کیا حق ہے کہ "انتہا" "ابتدا" کا بدلا ہوا روپ ہے"۔

ہیسن برگ (Heisen Berg) نے اپنی کتاب۔ (Philosoph ical science) میں کہا ہے:۔

"طبعیات (Physics) کے طریقے خارجی دنیا کی مطلق صداقتوں (Absolute Truth) کی دریافت کے ناقابل ہیں۔ ..... سائنس مذہب سے بھی زیادہ ناپائیدار ہے۔ سائنس کا کوئی آدمی گلیلیو یا نیوٹن کی باتوں کی غیر مشروط طور پر تائید نہیں کرسکتا۔ نہ خود اپنے دس سال قبل والے سائنسی اعتقادات (Belief) کی تائید کرسکتا ہے ..... اب عام طور پر سائنس کے علماء کو مادیت زیادہ اپیل نہیں کرتی۔ کیونکہ دوسروں سے زیادہ خود ان کو علانیہ نظر آرہا ہے کہ روحانی قدروں (Spri-tual Value) کی توجیہ الیکٹراں (Electron) اور پروٹانس (Pro tons) سے ناممکن ہے"

ایڈنگٹن (Eddington) نے اپنی کتاب (Philosophy of the Phisical science) میں کہا ہے:۔

"فیزکس (Physics) کوئی ایسے قوانین دریافت کرنے کی سرے سے صلاحیت ہی نہیں رکھتی، جو خارجی اشیاء پر لاگو ہوسکے"۔

سر جیمس بیکونائٹ (Sir James Beconite) نے اپنی کتاب (Science and the modern man) میں سائنسدانوں کے بارے میں صحیح اندازہ لگایا ہے:۔

"وہ کوئی ایسا جادوگر نہیں ہے جس کے پاس اسرارِ کائنات کی کنجی ہو۔ دوسرے انسانوں کی طرح اس کے طریقے (Methods) بھی بکثرت ناقص ہوتے ہیں اور اس کا علم بھی قطعی کبھی نہیں ہوتا۔ وہ بھی غلطیاں کرسکتا ہے۔ بلکہ مہمل باتوں تک کا قائل ہوسکتا ہے۔"

اَن سالوڈ پرابلمس آف سائنس (Unsolved problems of Science) نامی کتاب کے صفحہ ۳۰ کی عبارت بھی اس عام غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے کافی ہے۔ جو سائنسدانوں سے مرعوبیت کی وجہ سے ہم نے پیدا کرلی ہے۔

"غرض سائنس کی انتہا بھی یہی بتلانا ہے کہ چیزیں عمل کیسے کرتی ہیں نہ یہ کہ خود اپنی حقیقت میں کیا ہیں۔ غریب سائنس مذہب کے بارے میں کیا رائے قائم کرسکتی ہے۔"

وہائٹ ہیڈ (White Head) کی کتاب (science and the modern world) بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کررہی ہے۔

"سائنس کو قطعاً اس چیز سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ کوئی چیز خود کیا ہے۔ اس کو اشیا کی محض ظاہری واقفیت سے واسطہ ہوتا ہے۔"

سر جیمس بیکونائٹ نے اپنی کتاب (Modern mind and the modern man) میں سائنسدانوں کی حقیقت کو کس قدر واضح کردیا ہے:-

"بنیادی طور پر سائنسداں کا کارنامہ شاعر کے کارنامے سے مختلف نہیں ہوتا۔ حقیقت (Reality) نہ پوری طرح

سائنسداں کی گرفت میں آتی ہے اور نہ شاعر کی۔"

نیوٹن (NEWTON)

سترھویں صدی میں نیوٹن نے نظریۂ کشش (Law of Gravitation) پیش کیا اب کیا تھا۔ مذہب کے مخالفین کو بہترین حربہ ہاتھ آ گیا۔ اس اصول کا اطلاق نہ صرف زمین کی چیزوں پر بلکہ نظامِ شمسی کے سیاروں اور خود کائنات (Universe) کے وجود میں آنے اور اس کے مسلسل چلتے رہنے پر بھی کیا گیا۔ سائنسدانوں نے پوری کائنات کا نظم اسی کے سہارے مرتب کر دیا۔

جو لوگ خدا کا انکار کر چکے تھے، ان کے لیے کائنات کا وجود میں آنا اور اس کا مسلسل کام کرنا ایک مسئلہ بنا ہوا تھا۔ جس کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی تھی نیوٹن کے اس نظریہ نے ان کی گتھی سلجھا دی۔ چنانچہ فرانس کے مشہور ریاضی داں (Mathematician) لاپلاس (Laplace) نے یہاں تک کہہ دیا کہ:۔

"اس کائنات کی ایک ہی میکینکس ہو سکتی تھی اور اس کو نیوٹن نے دریافت کر لیا۔"

اب پوری کائنات کے وجود میں آنے اور منظم طور پر چلتے رہنے کے لیے نظریۂ "خدا" کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ چنانچہ اس اصول کو اس حد تک اچھالا گیا کہ لوگوں نے سمجھ لیا کہ طبعیات کے میدان میں تحقیقات کی ضرورت باقی نہیں رہی اور خدا کا سہارا لیے بغیر انہیں اصولوں کے ذریعہ پوری کائنات کی توجیہ کی جا سکتی ہے:۔

ڈالٹن کا نظریۂ ایٹم

(DALTONS ATOMIC THEORY)

جان ڈالٹن نے سترھویں صدی کے شروع میں یہ دعویٰ کیا کہ مادہ کا سب سے چھوٹا جزا ایٹم (Atom) ہے اور لینڈ الٹ (Landolt) نے 1900-1908 تک مختلف تجربات کے ذریعہ ثابت کیا کہ مادہ ازلی اور ابدی (Eternal) ہے۔ نہ تو پیدا کیا جا سکتا ہے اور نہ فنا ہی کیا جا سکتا ہے موم بتی کو جلایا جاتا ہے تو وہ جلتے جلتے ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن درحقیقت وہ فنا نہیں ہوتی بلکہ اس کے اجزاء مختلف شکلیں اختیار کر لیتے ہیں اور گیسوں کی شکل میں فضا میں موجود ہیں۔

جب مادہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا تو اس کو پیدا کرنے کے لیے کسی خالق کے ماننے کی کہاں ضرورت باقی رہتی ہے۔

لینڈ الٹ نے اپنے تجربوں کے ذریعہ ثابت کیا کہ خدا کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نیوٹن نے اس کی دوسری کڑی جوڑ دی کہ پوری کائنات بلا کسی بنانے والے کے بن گئی اور بلا کسی چلانے والے کے چل رہی ہے، چنانچہ فرانس کے مشہور سائنسداں لاپلاس پیری سائیمن (Laplas Pierre Simon) نے یہ دعویٰ کیا کہ:-

"اگر کسی خاص متعین وقت میں کائنات کی متعین حالت معلوم ہو جائے تو کائنات کے ماضی اور مستقبل کی پوری تاریخ قطعیت کے ساتھ معلوم ہو جائے گی۔"

(Modern belief part III)

اسی حقیقت کو سر جیمس جینس (Sir James Jeans) نے اپنی کتاب مسٹیریس یونیورس (Mysterious universe) میں ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے :-

"گلیلیو اور نیوٹن کی سترہویں صدی کی سب سے بڑی کامیابی مان لی گئی تھی کہ کائنات میں ہر مابعد تغیر اپنے ماقبل کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ کائنات فطرت کی پوری تاریخ —— کل وہ کیا تھی —— آج کیا ہے —— اور آئندہ کیا ہوگی —— اس کی ابتدائی حالت کا لازمی نتیجہ ہے۔"

یہ چند نمونے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب ایک مرتبہ سائنسدانوں کی تحقیقات کا رخ "انکارِ خدا" کی طرف مڑ گیا تو برابر اسی طرف مڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ کائنات، نباتات، حیوانات سب کی توجیہ خدا کے بغیر ہی کر ڈالی گئی۔ لیکن بعد کے ادوار میں ایسے سائنسداں پیدا ہوئے جنھوں نے پچھلے سائنسدانوں کے نظریات پر کھل کر تنقید کی اور ان کی خامیوں کو اجاگر کیا۔ یہ وہ سائنسداں تھے جن کا اکابرین میں شمار ہوتا ہے۔ اس لیے نہ صرف سائنس دشمنی کا خاتمہ ہو گیا بلکہ خود سائنسدانوں کے اندر مذہب کی طرف خاصا جھکاؤ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ برنارڈ بیونگ نے اپنی کتاب (Modern science and its philosophy) میں اسی رجحان کی طرف اشارہ کیا ہے :-

"آج کل مشکل سے کوئی رسالہ یا کتاب کھولو گے جس میں عام سائنسی خیالات سے بحث ہو اور اس طرح کے بیانات سے دوچار ہونا نہ پڑے —— گلیلیو کے عہد کا خاتمہ —— سائنس کی روح دشمنی ختم —— میکانکی طبیعات کی ناکامی —— مذہب اور سائنس

میں مصالحت"

کہاں تو سائنس اور مذہب کی دشمنی ایک مسلّمہ حقیقت بن چکی تھی۔ اور کہاں سائنس کا جھکاؤ مذہب کی طرف اس حد تک بڑھ گیا کہ برنارڈ شاہ نے اپنی ایک کتاب کا نام ہی رکھ دیا "موجودہ سائنس مذہب کی راہ پر" (Modern Science on the path of religion) علمی حلقوں کے خیالات میں اس قدر تبدیلی بلا وجہ نہ تھی۔ ابتدا میں کلیسا اور سائنسدانوں کے ٹکراؤ نے فضا کو اس قدر مکدر کر دیا تھا اور سائنسدانوں کے دل و دماغ پر مذہب کے خلاف ایک تعصب پیدا ہو گیا تھا کہ ان کی تحقیقات کا رخ مذہب اور خدا کے خلاف مڑ گیا مگر بعد کے ادوار میں وہ تعصب باقی نہ رہا۔ دوسری طرف ایسے ایسے انکشافات ہوئے جن سے پچھلی تحقیقات بالکل غلط ہو کر رہ گئیں جان ڈالٹن کا نظریہ یہ تھا کہ اگر کسی چیز کو چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کیا جائے تو مادہ کا آخری جز ایٹم ہوگا جو مزید تقسیم نہیں ہو سکتا۔ یہ ایٹم جو مادہ کا سب سے چھوٹا جز ہے اپنا مستقل وجود رکھتا ہے۔ جگہ گھیرتا ہے۔ اور اس میں وزن بھی ہوتا ہے اس کے مقابلہ میں توانائی (Energy) کا مستقل وجود ہی نہیں ہے۔ نہ وہ جگہ گھیرتی ہے۔ اور نہ اس میں وزن ہی ہوتا ہے اس طرح مادہ (Matter) اور توانائی (Energy) دو متضاد چیزیں ہیں —— اب نظریہ کوینٹم (Quantum) نے مادہ کی حیثیت ہی بدل دی۔ اب مادہ اور توانائی دو الگ چیزیں نہیں ہیں۔ مادہ توانائی میں بدلا جا سکتا ہے اور توانائی مادہ میں۔ اس طرح مادہ جس پر مادیت اور دہریت کی بنیاد تھی غیر مادی ہو گیا اب تو اس کا وجود بھی ایک چیستاں بن کر رہ گیا —— سائنسدانوں نے ایک مادی ذرہ دریافت کیا ہے جو مادہ کا بنیادی جز ہے لیکن اس کا وجود بھی ایک سیکنڈ کے ایک کھرب ویں حصہ کے سوویں حصہ کی مدت تک

رہ سکتا ہے۔اسی ذرہ کو "سی ناٹ" کا نام دیا گیا ہے۔

اب تک مادّہ کا سب سے چھوٹا جز ایٹم تھا اس کے بعد الیکٹران، پروٹان نیوٹران اور پازیٹران سب سے چھوٹے جز قرار پاتے تھے لیکن اب سب سے چھوٹا جز "سی ناٹ" ہے اور جس کا وجود بھی ایک چیستاں سے کم نہیں۔اب تو کائنات کے ازلی اور ابدی (Fternal) ہونے کا تصور بھی ختم ہو گیا۔یہی سائنسداں جن کا کل تک ایمان تھا کہ مادّہ ازلی اور ابدی ہے اس لیے اس کی تخلیق کے لیے کسی "خدا" کے ماننے کی ضرورت ہی نہیں۔آج حساب لگا کر بتلا رہے ہیں کہ اتنے ارب اور اتنے کھرب سال قبل دنیا موجود نہیں تھی اور اتنے ارب اور اتنے کھرب سال بعد دنیا فنا ہو جائے گی۔

نیوٹن کے نظریہ کشش نے کائنات کو ایک مشین ثابت کر دیا تھا جس میں ارادہ (Free will) کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ہر چیز متعین تھی۔اس کے خلاف ممکن ہی نہیں تھا۔اور اب کیونٹم (Quantum) کے نظریہ نے ہر چیز کو غیر یقینی بنا دیا۔چنانچہ ہاسٹل (Hastell) نے اپنی کتاب (Unsolved-problem of Science) میں نیوٹن کے نظریہ کی دھجیاں بکھیر دیں:۔

"اب تک کا نظریہ یہ تھا کہ کائنات کی ہر حرکت اٹل اور یقینی ہے اس میں کوئی تبدیلی ہو ہی نہیں سکتی — بالکل غلط ہے۔بلکہ خود مادّہ جس سے کائنات بنی ہے غیر یقینی ہے..... بنیادی ایٹیں (الیکٹرونس اور پروٹانس) کسی قانون علت و معلول (Cause and effect) کے تابع نہیں معلوم ہوتے ان کے سارے حالات کا علم ہو بھی جائے تو بھی ہم نہیں بتا سکتے کہ فلاں ذرہ ایک سیکنڈ منٹ — یا سال بعد کیا کر رہا ہوگا"

ایڈنگٹن (Eddington) نے کہا تھا کہ:۔

"جس طرح زندگی کا ناقابل اعتبار ہونا ضرب المثل ہے اسی طرح ایٹم کے کیونٹم کا دوسرا جست ناقابل اعتبار ہے۔ اور نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کیا اور کہاں ہوگا۔"

ھسنبرگ (Hesein Berg) نے اپنی کتاب (Philosophy of - physical science) میں کہا ہے:۔

"مجھے اب بھی اس سوال پر زور دیتے رہنا چاہیے کہ سائنسی مشاہدات میں ہم درحقیقت کس چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں؟ اضافت کا جواب ہے کہ علائق (Relations) کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور کوینٹم کا جواب ہے کہ امکانات —— (Probabilities) کا مشاہدہ کرتے ہیں۔"

بڑے طمطراق کے ساتھ یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ ایٹم کے ذریعہ چیزوں کا بننا — اور ان چیزوں کا مزید پیچیدہ شکلوں میں تبدیل ہونا — ان میں نئی نئی خصوصیات کا ظہور — یہ سب چند بنے بندھے اصول کا کارنامہ ہے۔ جن کو ہمارے سائنسدانوں نے دریافت کرلیا ہے۔ اس لیے نہ کسی خدا کا وجود اور نہ کوئی ضرورت — یہ تھا سائنسدانوں کا اپنے نظریات پر اٹل ایمان — اور اب حال یہ ہے کہ سائنسداں خود ہی اعتراف کر رہے ہیں کہ ہماری آنکھوں کی وہاں تک رسائی ہی نہیں۔

سر آرتھر کیتھ جیسے نامور سائنسداں کو حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کرنا پڑا:۔

"ہم زندگی کی ابتدائی حقیقت کو نہیں جانتے۔ اس سے بھی زیادہ

اس امر سے جاہل ہیں کہ مادّہ نے پہلے پہل زندگی کیوں اختیار کی"۔

عام سائنسدانوں کا اعتراف ہے:۔

"کائنات ایک کتاب ہے جس کا اوّل اور آخر غائب"

سرجیمس جینس نے سائنسدانوں کی پوزیشن کو ٹھیک سمجھا تھا:۔

"کائنات کی ابتدا اور انتہا کے سوالات سے نہ سائنس کو سروکار ہے اور نہ رسائی"

وہائٹ ہیڈ نے اپنی کتاب (Science and the Modern World) میں ٹھیک ہی کہا ہے کہ ایک وقت وہ تھا کہ سائنس نے روح کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اور آج وہی روح سائنسدانوں کی تحقیقات کا موضوع بنی ہوئی ہے:۔

"اس سے پہلے کی دنیا کا ڈرامہ خارجی کائنات تھی اور آج کی دنیا کا ڈرامہ روح (Soul) ہے۔

خدا کا اقرار

سائنسدانوں کی ٹولی اپنے آلات سے مسلح ہو کر اپنی اپنی تجربہ گاہوں (Laboratries) میں بیٹھی تھی کہ خدا کے انکار کے لیے مواد فراہم کیا جائے ــــ خدا کا اقرار کر کے اٹھی۔ چنانچہ سرجیمس جینس موجودہ دور کے سب سے مشہور سائنسداں نے خدا کا اقرار ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"انتہائی حقیقت: ایک اور صرف ایک ہے ــــ ابدی اور کائناتی روح ــــ باقی سب اسی کی مخلوق ہیں"

ابتداءً خدا کے نام سے جو بغض پیدا ہو گیا تھا، وہ خدا کے اقرار کے باوجود

اب بھی قائم ہے۔اس آخری حقیقت کو خدا کہنے کے باوجود کوئی "ابدی روح" (Ultimate reality) کہتا ہے تو کوئی اور کوئی (Universal Mind) لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سارے الفاظ کا مفہوم وہی ہے جس کے لیے لفظ "خدا" استعمال ہوتا ہے۔

نیوٹن کا قانونِ کشش (Law of Gravitation) ہو یا ماکس پلانک (Max plank) کا کوانٹم نظریہ، ڈارون کا نظریہ ارتقاء (Evolution theory) ہو یا انتہائی حقیقت (Ultimate reality) کی تلاش۔یہ اونچی باتیں ہیں جو عام لوگوں کی سمجھ سے باہر ہیں۔ کوانٹم نظریہ نے نیوٹن کے قانون کشش کو رد کر دیا۔ڈارون کا نظریۂ ارتقاء اب تک ثابت نہ ہو سکا لیکن عام لوگوں کی ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ ان چیزوں کا ذکر کچھ اس انداز سے ہوتا ہے کہ گویا یہ مسلمہ حقیقتیں ہیں۔اس مرعوبیت کی وجہ سائنسی ایجادات ہیں جیسا کہ فلپ فرانک نے کہا ہے:

"سائنس کے نظریات سے زیادہ عوام و خواص کے ذہنوں کو سائنسی ایجادات نے مرعوب کیا ہے"

عوام کی اس ناواقفیت اور مرعوبیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مذہب کے مخالفین نے سائنس کی دریافتوں سے ایسے الٹے پلٹے نتیجے اخذ کیے تاکہ خدا کی خالقیت سے بچا جا سکے چنانچہ سر آرتھر کیتھ (Sir Arther Keith) نے اسی ذہنیت کی طرف اشارہ کیا ہے:

"ارتقا (Evolition) نہ صرف ناثابت بلکہ ناقابلِ ثبوت ہے لیکن اس کو مانتے ہیں۔اس لیے کہ اس کا واحد بدل نظریۂ تخلیق ہے۔جو قابلِ فہم نہیں ہے"

مشاہدہ اور استنباط

(OBSERVATION AND INFRENCE)

سائنسداں گروہ نے اپنے مشاہدہ پر اس حد تک زور دیا کہ مشاہدہ کے علاوہ کسی دوسرے ذریعہ معلومات کو ماننے ہی کو تیار نہ ہوئے۔ اور اب جبکہ دوربین (Telescope) خوردبین (Microscope) اور اکسرے (X-ray) وغیرہ آلات نے مشاہدہ کی قوت کو بے حد و حساب بڑھا دیا ہے تو انہیں کامل یقین ہو گیا کہ اب بھی اگر کوئی چیز مشاہدہ میں نہیں آتی ہے تو اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ اس چیز کا کوئی وجود نہیں ہے۔ لیکن آج خود سائنس نے استنباطی استدلال کی اہمیت کو محسوس کر لیا ہے۔ اور مشاہدہ کے مقابلہ میں استنباط کی اہمیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اب جبکہ خود سائنسی دنیا میں استنباط (Inference) ایک اہم ذریعہ معلومات تسلیم کر لیا گیا ہے کائنات کا ایک ایک ذرہ خدا کے وجود کا ایک زبردست استنباطی ثبوت پیش کر رہا ہے۔

دنیا کے جغرافیہ داں اس بات کو تسلیم کر چکے ہیں کہ ہماری دنیا نظام شمسی (solar System) کا ایک ممبر ہے جس میں ہماری دنیا کے علاوہ مرکری (Mercury) وینس (venus) مارس (Mars) جوپیٹر (Jupiter) سیٹرن (Saturn) یورنیس (Urenus) نیپچون، (Neptuine) اور پلوٹو (Pluto) شامل ہیں۔ یہ تمام سیارے سورج کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اس نظام شمسی کا قریب ترین سیارہ مرکری اور بعید ترین پلوٹو ہے جس کی دوری سورج سے چار ارب ساٹھ کرور (4600,000,000)

میل ہے اور ہماری دنیا سورج سے صرف نوکروڑ تیس لاکھ (93000,000) میل دور ہے۔ یہ سوال ذہن میں اٹھ سکتا ہے کہ ہماری دنیا سورج سے صرف نوکروڑ تیس لاکھ ہی میل دور کیوں ہے؟ فاصلہ اس سے کم یا زیادہ کیوں نہ ہوا؟ مذہب کے مخالف گروہ کے پاس اس کے علاوہ کوئی جواب نہیں ہے کہ یہ محض اتفاق تھا۔ لیکن اسی گروہ کے لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر زمین سورج سے زیادہ قریب ہوتی تو سورج کی کرنیں اتنی تیز پڑتیں کہ اس پر زندگی ناممکن ہو جاتی۔ چنانچہ کنیڈا کی مینٹوبا یونیورسٹی کے پروفیسر نے باقاعدہ حساب لگا کر بتلایا ہے کہ خواہ زمین کی سورج سے دوری کم ہوتی یا زیادہ دونوں صورتوں میں زمین پر زندگی ناپید ہوتی۔

اگر سائنس کی دنیا میں استنباط (Inference) ایک اہم ذریعہ معلومات ہے تو مذکورہ بالا سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس دنیا کا ایک خالق ہے جس نے اپنے پروگرام کے تحت زمین کی سورج سے دوری اتنی ہی رکھی جس میں زندگی ممکن ہو سکے۔

ہماری زمین کے اوپر ہوا کا ایک غلاف ہے جس کی موٹائی پانچ سو میل ہے، جس میں ہم لوگ ڈوبے ہوئے ہیں۔ اگر یہ موٹائی موجودہ موٹائی کی آدھی ہوتی تو دباؤ اتنا کم ہوتا کہ ہمارے جسم کے خون کی نلیاں پھٹ جائیں اور کوئی زندہ نہ بچتا ــــ اتنے کم دباؤ میں تو ہمارے کھانے بھی نہیں پک سکتے۔ سائنس کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ اگر ہوا کا دباؤ ــــ (Pressure) کم ہو جائے تو نقطۂ ابال (Boiling point) کم ہو جاتا ہے۔ اگر کسی چیز کے پکنے کے لیے ۱۰۰ ڈگری درجۂ حرارت کی ضرورت ہے اور

دباؤ کم ہو جانے کی وجہ سے اس کا درجۂ حرارت ۹۵ ڈگری ہو جاتا ہے۔ تو چاہے اس کو کتنا ہی دیر تک گرم کیا جائے اس کا درجہ حرارت بڑھ نہیں سکتا — اس کے برخلاف اگر ہوا کی تہہ دوگنی ہوتی تو ہوا کا دباؤ اتنا زیادہ ہو جاتا کہ ہماری ہڈی پسلی چور ہو جاتی۔

صاف نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ضرور اس دنیا کا کوئی خالق ہے جس نے ناپ تول کر اتنی ہی موٹی ہوا کی تہہ رکھی جس سے زمین پر زندگی ممکن ہو سکے کیونکہ ہوا کی تہہ کی کم موٹائی میں بھی ہم مر جاتے ہیں اور زیادہ موٹائی میں بھی زندہ نہیں رہتے۔

● ہماری زمین کے چاروں طرف پانچ سو میل موٹا ہوا کا ایک غلاف ہے جس میں ہم سب ڈوبے ہوئے ہیں۔ حجم (Volume) کے لحاظ سے اس ہوا میں ۷۸ فیصدی نائٹروجن (Nitrogen) اور ۲۱ فیصدی آکسیجن (oxy-gen) اور ۴ فیصدی کاربن ڈائی آکسائڈ (Carbondioxide) اور ۰۳ء ۹ فیصدی انرٹ گیسس (Inert Gasses) ہیں جن میں ہیلیم (Helium) نیون (Neon) آرگن (Argon) زینان (Zenon) اور کرپٹان (Kripton) موجود ہیں — ہوا کے اس غلاف میں مذکورہ گیسوں کی موجودگی کے لیے کوئی سائنسی دلیل نہیں ہے اور نہ ان کے تناسب (Ratio) کی کوئی معقول توجیہ کی جا سکتی ہے — اگر اس ہوا میں ساری گیسیں ہوتیں صرف آکسیجن نہ ہوتی تو اس زمین پر زندگی ممکن نہیں تھی۔

● ہماری زمین مثل نارنگی کے گول ہے یعنی شمالی اور جنوبی سرا ذرا چپٹا ہے۔ اس طرح خط استوا (Equator) پر اس کا قطر (Diameter) آٹھ ہزار (8,000) میل ہے زمین کے موجودہ حجم کے لیے کوئی سائنسی دلیل

نہیں ہے۔ اس لیے اس کا حجم زیادہ بھی ہو سکتا تھا، کم بھی۔ اگر یہ دنیا موجودہ حالت کے مقابلہ میں آدھی ہوتی تو اس کی کشش ایک چوتھائی رہ جاتی۔ آج جس چیز کا وزن چار کوئنٹل ہے صرف ایک کوئنٹل رہ جاتا۔ ہوا کا موجودہ غلاف اسی کشش کی وجہ سے زمین سے چپکا ہوا ہے۔ اگر یہ کشش کم کر دی جائے تو ہوا کا غلاف فضا میں گم ہو جائے اور ہم بغیر ہوا کے مر جائیں۔

ہارورڈ یونیورسٹی (Har ward univorsity) کے پروفیسر فلیشر واسٹن (Flacher waston) کی دریافت ہے کہ دنیا کی فضا میں ہر روز ایک ارب (1,000,000,000) شہاب ثاقب (Eeteor) داخل ہوتے ہیں جن کی رفتار رائفل کی گولی سے بھی تیز ہوتی ہے لیکن ان میں اکثر اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ہوا کے خطہ میں داخل ہوتے ہی ہوا کی رگڑ سے جل جاتے ہیں اور ان کی جلی ہوئی راکھ روزانہ پانچ ٹن زمین پر گرتی ہے۔ جو ذرا بڑے ہوتے ہیں اگرچہ ان کی تعداد روزانہ چار یا پانچ سے زیادہ نہیں ہوتی زمین سے ٹکرا جاتے ہیں اور زمین کی سطح پر بہت بڑا گڈھا بنا دیتے ہیں۔ اب تک ایسے پچاس گڈھوں کا پتہ لگایا جا چکا ہے۔ ابھی حال میں جو لوگ چاند پر گئے ہیں ان کا کہنا ہے کہ چاند کی سطح پر بہت سے گڈھے ہیں۔ جغرافیہ دانوں کا خیال ہے کہ یہ گڈھے شہاب ثاقب (meteor) کی ٹکر کی وجہ سے بنے ہیں کیونکہ چاند کے اوپر ہوا کا کوئی غلاف نہیں ہے۔ جو اس کو شہاب ثاقب کی ٹکر سے بچا سکے —— اگر زمین کا سائز کم ہوتا تو اس کی کشش اتنی کم ہو جاتی کہ ساری ہوا فضا میں گم ہو جاتی۔ اور ہوا کی عدم موجودگی میں یہ شہاب ثاقب ہماری کھوپڑیاں چکنا چور کر دیتے۔ اور زمین کی سطح پر ہمارا وجود نابید

اگر زمین کا حجم موجودہ حجم کا دوگنا ہوتا تو کشش اتنی زیادہ ہو جاتی کہ ہوا کا غلاف سمٹ کر چند میل رہ جاتا اور ہوا کا دباؤ اتنا بڑھ جاتا کہ ہمارا جسم اتنے زیادہ دباؤ کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ الغرض زمین کا حجم کم ہوتا یا زیادہ دونوں صورتوں میں اس زمین پر ہمارا وجود ممکن نہیں تھا۔

آج سائنس کی دنیا میں استنباط (Inference) کو ایک اہم ذریعۂ معلومات تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اس لیے مذکورہ بالا حقائق اور ایسے ہی ہزاروں دوسرے حقائق زبان حال سے بول رہے ہیں کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے، جس نے ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت اس کائنات کو وجود بخشا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو واقعی سائنسداں ہیں اور جن کو سائنس کی دنیا میں ایک اہم مقام حاصل ہے انہوں نے خدا کا انکار کبھی نہیں کیا۔ یا تو خدا کا اقرار کیا ہے یا خاموش رہے ہیں۔ یہ وہ کچے پکے سائنسداں تھے جنہوں نے جوش میں آ کر خدا کا انکار کر دیا اور سائنس کی دریافتوں کو توڑ مروڑ کر اس طرح پیش کیا جس سے ثابت کیا جا سکے کہ اس کائنات کا کوئی خالق نہیں ہے۔ یہ خود بن گئی ہے اور خود چل رہی ہے۔ لیکن اب خود سائنس کے میدان میں ایسی ایسی تحقیقات سامنے آتی جا رہی ہیں جن کی موجودگی میں خدا کے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ استنباط کو اہم ذریعہ معلومات تسلیم کرنے کے بعد خدا کو مانے بغیر چارہ نہیں۔ قرآن جو استنباطی طرز استدلال کا شاہکار ہے خدا اور اس کی صفات کے بارے میں اتنے مضبوط دلائل پیش کر رہا ہے کہ سائنسدانوں کو بھی خدا کا اقرار کرنا پڑا۔

خدا کا تصوّر

سائنس نے تو تسلیم کر لیا کہ اس کائنات کا ایک بنانے والا ہے لیکن اس سلسلہ کے بہت سے سوالات اب بھی باقی رہ جاتے ہیں۔ مثلاً" خدا کیا ہے؟ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ وغیرہ لیکن ان میں سے کوئی بھی چیز انسان کے براہ راست مشاہدہ میں نہیں آسکتی۔ ان سب کا تعلق غیب سے ہے اور غیب کا علم صرف خدا کو ہے۔ اس سلسلہ میں بات وہی صحیح ہوگی جو خود اس کائنات کے بنانے والے نے اپنے نبیوں کے ذریعہ تبلایا ہے۔ ان چیزوں کے بارے میں وحیٔ رسالت سے بے نیاز ہو کر انسان نے جب بھی کوئی رائے قائم کی ہے، علم کے بغیر ہی قائم کی ہے۔ براہ راست علم کا کوئی ذریعہ ہوتا تو اتنے مختلف اور متضاد عقیدے پیدا نہ ہوتے۔ انسانوں کے دماغوں میں سوچے ہوئے جوابات نہ کبھی ایک رہے ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ ہم اور ہمارا پورا ماحول مادّی (Mate real) اور خدا غیر مادّی۔ اس لیے ہم ہزار کوشش کریں مگر گھوم پھر کر مادّیت میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ ہمارے دانشوروں نے خدا کا تصوّر دینے کے لیے جو الفاظ استعمال کیے وہ محض تشبیہات اور استعارات کی حد تک تھے تا کہ ہم خدا کے صحیح تصوّر کے قریب پہونچ سکیں۔ لیکن عام انسان مادّیت اور غیر مادّیت کے فرق کو نہ سمجھ سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ استعارات مزید غلط فہمی کا ذریعہ بن گئے۔ مثال کے طور پر رام لال ایک بڑھئی ہے اسکی بنائی ہوئی میز، کرسی اور دوسرے فرنیچر ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر ایک شخص کسی مقام پر اسی بڑھئی کی بنائی ہوئی میز کو دیکھ کر یوں کہے" واہ رے رام لال! میز کا جوڑ صفائی اور فنش ہر چیز بول رہی ہے کہ میں رام لال

ہوں" یا یوں کہے "میز کے ہر جز میں میں رام لال کو دیکھ رہا ہوں" تو کوئی شخص بھی اس کا یہ مطلب نہ لے گا کہ رام لال انسان نہیں لکڑی ہے۔ اور نہ یہی سمجھے گا کہ رام لال میز کی ہر چیز میں بیٹھا ہوا ہے۔ چونکہ میز کا بنانے والا (رام لال) اور جو چیز بنائی گئی (میز) دونوں مادی ہیں اس لیے غلط فہمی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ غبی سے غبی انسان بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ رام لال میز ہے یا میز کے اندر بیٹھا ہوا ہے لیکن خدا چونکہ غیر مادّی ہے اور اس کی بنائی ہوئی چیزیں انسان، دنیا، کائنات سب کی سب مادّی ہیں اس لیے بڑے بڑے عقل والے بھی غلط فہمی میں مبتلا ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انسانی دماغ کے تیار کردہ جوابات بے حد متضاد ہیں جس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ان چیزوں کے بارے میں انسان کے معلومات کا کوئی ذریعہ نہیں ہے سوائے ظن و گمان کے۔ پیغمبروں نے خدا کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں وہ ان کے اپنے دماغ کی پیداوار نہ تھیں بلکہ خود خدا کی فراہم کردہ تھیں۔

خدا کی عظمت

مادّی انسان کے لیے غیر مادّی خدا کا مشاہدہ ناممکن ہے۔ پھر بھی اسکی بنائی ہوئی چیزوں کی معلومات اس کی عظمت اور کبریائی کا تصور دینے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ خدا کی عظیم الشان تخلیق ایک طرف اس کی عظمت کا نقش دل و دماغ پر بٹھاتی ہے اور دوسری طرف انسان کی کم مائگی کا احساس دلاتی ہے۔

پروفیسر کامسکی نے خبر دی ہے کہ ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء کو صبح ۳ بج کر ۱۴ منٹ پر سورج میں ایک زبردست دھماکہ ہوا اور اس کی سطح پر ایک

بہت بڑا شگاف پڑ گیا۔ یہ شگاف اتنا بڑا ہے کہ اس میں ہماری زمین جیسی تین زمینیں سما سکتی ہیں۔ یہ وہی سورج ہے جو روزانہ مشرق سے طلوع ہو کر اپنی پوری چمک دمک دکھلا کر مغرب میں ڈوب جاتا ہے چونکہ یہ روزانہ کا معمول ہے اس لیے ہماری توجہ کا مرکز نہ بن سکا اور نہ ہم نے کبھی سوچا کہ یہ سورج کیا ہے؟ کیسے مسلسل چمکتا رہتا ہے؟ — یوں تو دیکھنے میں عام نگاہوں کو یہ سورج ایک تھالی کے برابر دکھلائی پڑتا ہے لیکن موجودہ تحقیقات کے مطابق ہماری زمین سے بہت بڑا ہے۔ اتنا بڑا کہ ہماری زمین جیسی تیرہ لاکھ (1300,000) زمینیں اس میں سما سکتی ہیں۔ اس کی تیز چمک کی وجہ سے اندر کے حالات بہت کم معلوم ہو سکے ہیں۔ سورج گہن کے وقت جب سورج کی ٹکیہ چاند کی آڑ میں آجاتی ہے تو سورج کے کنارے کا حصہ آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے چنانچہ موجودہ تحقیقات کے مطابق سورج کی ٹکیہ کے چاروں طرف دو سو میل ایک فضا ہے جس کو فوٹو اسفیر (Pho to sphere) کہتے ہیں اور اس کے اوپر دو مزید تہیں ہیں جن کو کرونو اسفیر (Chro Mo sphere) اور بالکل باہری تہہ کو کورونا (Corona) کہتے ہیں۔ سورج کی تشتری پر بہت سے دھبے حرکت کرتے ہوئے دکھلائی پڑتے ہیں جن کو سن اسپاٹ (Sun spot) کہتے ہیں۔ ان دھبوں کا قطر (Diameter) چند سو میل سے لے کر ساٹھ ہزار (60,000) میل تک ہوتا ہے۔ سورج کے کنارے والے حصہ سے لمبی لمبی لپٹیں نکلتی ہیں جن کو اسپیکولس (opicules) کہتے ہیں۔ یہ سینکڑوں میل اوپر اٹھتے ہیں اور چار پانچ منٹ کے اندر واپس آجاتے ہیں۔

اس مختصر بیان سے سورج کے بارے میں تھوڑا سا اندازہ ہو سکتا ہے۔ رہا اس کی گرمی کا سوال تو بقول سر جیمس جینس (Sir James Jeans)

کے سورج کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جو صرف آلپین کے سر کے برابر ہو اتنی گرمی رکھتا ہے کہ اگر یہی ٹکڑا ایک ہزار میل کی دوری پر رکھ دیا جائے تو ایک انسان کو ہلاک کر دینے کے لیے کافی ہے۔

کائنات میں لاتعداد سورج ہیں۔ ہمارا سورج بھی انہیں میں سے ایک ہے، مگر چونکہ یہ سب سے قریب ہے اس لیے بہت تیز چمکتا ہوا دکھلائی دیتا ہے اور بقیہ سورج بہت دور ہیں اس لیے ان کی چمک اتنی تیز نہیں ہوتی۔ ان دور دراز سورجوں کی دوری ــــــ کروڑ دو کروڑ یا ارب دو ارب میل نہیں ہے بلکہ ہمارے پاس اتنی بڑی کوئی عدد ہی نہیں ہے جس سے ان کی دوری کو بتلایا جا سکے۔ چنانچہ ان کی دوری کو ناپنے کے لیے ایک مستقل اکائی (Unit) مانی گئی جس کو "نوری سال" (Light Year) کہتے ہیں ــــ روشنی بہت تیز چلتی ہے یعنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار (186,000) میل چلتی ہے تو ایک منٹ میں اس کا ساٹھ گنا چلے گی (186,000x60) میل اور ایک گھنٹہ میں (186,000x60x60) میل چلے گی۔ اسی طرح ایک دن میں (186,000x60x60x24) میل چلے گی۔ اسی رفتار سے پورے ۳۶۵ دن چلتی رہے تو جو فاصلہ طے کرے گی اس کو ایک "نوری سال" مانا جاتا ہے۔ ان دور دراز سورجوں تک روشنی پہونچنے میں سینکڑوں سال لگ جاتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ سورج ہم سے کتنی دور ہیں

بعض سورج ہمارے سورج سے بہت زیادہ روشن ہیں جو نیلے رنگ کے دکھلائی دیتے ہیں اور بعض ہمارے سورج سے نسبتاً کم روشن ہیں جو سرخ رنگ کے دکھلائی دیتے ہیں۔ انہیں سورجوں میں ریگل (Regal) بھی ایک سورج ہے جو ہمارے سورج سے پندرہ ہزار گنا زیادہ روشن ہے۔

انٹاری (Antarea) ایک دوسرا سورج ہے جو جسامت میں اتنا بڑا ہے کہ اس میں ہمارے سورج جیسے تین کروڑ ساٹھ لاکھ (36,000,000) سورج رکھے جا سکتے ہیں۔ ہر سورج کے گرد بہت سے سیّارے (Planets) بھی ہوتے ہیں جو اپنے سورج کے گرد گھومتے رہتے ہیں سورج اور اُن کے گرد گھومنے والے سیاروں کے جھرمٹ کو نظامِ شمسی (Solar System) کہتے ہیں۔ جس نظامِ شمسی میں ہماری دنیا شامل ہے اس میں کل نو سیّارے شامل ہیں جن میں قریب ترین مرکری (Mercury) اور بعید ترین پلوٹو (Pluto) ہے جس کی سورج سے دوری چار ارب ساٹھ کروڑ (4600,000,000) میل ہے۔

ہمارے نظامِ شمسی کے بارے میں یہ مختصر معلومات اس بات کے لیے کافی ہیں کہ ہم کو اندازہ ہو جائے کہ یہ نظامِ شمسی کتنا بڑا ہے۔ اتنے بڑے نظامِ شمسی میں ہماری زمین کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ کائنات میں نظامِ شمسی بھی ایک دو نہیں۔ بلکہ لاتعداد نظامِ شمسی ہیں۔ یہ نظامِ شمسی جگہ جگہ جھرمٹ بناتے ہیں جن کو گلیکسی (Glaxy) کہتے ہیں۔ گلیکسی بھی لاتعداد ہیں۔ جس گلیکسی میں ہمارا نظامِ شمسی ہے اس میں تین ارب (3,000,000,000) سورج مع اپنے نظامِ شمسی کے موجود ہیں اور ان تین ارب سورجوں میں جو سورج ہماری زمین سے زیادہ قریب ہے وہ بھی اتنی دور ہے کہ اس کی روشنی ہم تک پہونچنے میں چار سال لگ جاتے ہیں — بہت سے گلیکسی مل کر نیبولا (Nebula) بناتے ہیں۔ اور کائنات میں نیبولا بھی ایک دو نہیں ہیں۔ اب تک کی تحقیقات کے مطابق بیس لاکھ (2,000,000) نیبولا کا پتہ لگایا جا چکا ہے۔ جو نیبولا ہماری زمین سے زیادہ قریب ہے وہ بھی اتنی دور

ہے کہ اس کی روشنی ہم تک پہونچنے میں دس لاکھ (1,000,000) سال لگ جاتے ہیں۔ جوں جوں زیادہ طاقتور دوربینیں بنتی جا رہی ہیں نیبولا کی تعداد کی جانکاری بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ سرجیمس جینس (Sir James Jeans) نے صحیح کہا تھا:۔

"دنیا کے سارے سمندروں کے ساحلوں پر جتنے بالو کے ریزے پائے جاتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ آسمان میں تارے ہیں"

(The Mysterious Universe)

ایک چٹکی بالو کے ریزے شمار سے باہر ہیں۔ دنیا کے سمندروں کے ساحلوں کے بالو کے ریزے کون شمار کر سکتا ہے اور وہ کونسا عدد ہوگا جو اس تعداد کو ظاہر کر سکے؟

یہ کائنات کتنی بڑی ہے؟ اس کا تو اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک شخص ایک طرف اپنی حقیر ہستی کو دیکھتا ہے اور دوسری طرف یہ وسیع و عریض کائنات — دنیا — نظام شمسی — گلیکسی — اور لاتعداد نیبولا تو بے اختیار بول اٹھتا ہے:۔

"کائنات کا خالق کتنا عظیم ہے"

وہ سوچنے لگتا ہے کہ اتنی بڑی کائنات کا خالق کیا کچھ ہوگا، اس کی عظمت اور کبریائی کا تو تصور بھی ذہنوں میں نہیں سما سکتا۔ انسان کو اپنے علم کی محدودیت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ وہ دنیا کے بارے میں کتنا کم جانتا ہے.... نظام شمسی کے بارے میں تو اس کی معلومات اور بھی کم ہیں... گلیکسی اور نیبولا کے بارے میں تو اس کی معلومات صفر کے برابر ہے۔ کائنات کیا ہے؟ کتنی بڑی ہے؟ اور پھر اس عظیم کائنات کا خالق کیا کچھ ہوگا؟ اس کا صحیح تصور تو انسان

کر ہی نہیں سکتا۔ اس لیے جو تصوّر اللہ کے پیغمبروں نے دیا ہے وہی صحیح ہے۔

خدا کی رحمت

اس کائنات کا ایک خالق ہے۔ اس کی ہر تخلیق حکمت کی شاہ کار ہے۔ اسکی بے پایاں رحمت ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے انسان اس کائنات کی مرکزی شخصیت ہے۔ جس کو اس کے خالق نے اعلیٰ صلاحیتیں دے کر اس نعمت بھری دنیا میں بھیجا ہے اور اس کی ضروریات کی فراہمی کا پورا پورا انتظام بھی کیا ہے۔ ہر آن اس کی ضروریات کی فراہمی پر کتنی طاقتیں لگی ہوئی ہیں، بے چارے انسان کو اس کی خبر بھی نہیں۔ زمین اپنے اندر ایک عظیم خزانہ رکھے ہوئے ہے، جو برابر انسان کے کام آ رہا ہے۔ آسمان سے رحمت کی بارش ہو رہی ہے ہزاروں چیزیں بالواسطہ اور بلاواسطہ اس کی خدمت پر معمور ہیں جس کا انسان کو احساس بھی نہیں ہے۔

گیہوں ہماری غذا کا ایک معروف جز ہے۔ لیکن کم ہی لوگ اس پر غور کرتے ہیں کہ گیہوں کا ایک دانہ کیسے تیار ہوتا ہے۔ اس کی تیاری میں کتنی قوتیں لگی ہوئی ہیں! ـــــ ہر شخص جانتا ہے کہ اگر گیہوں کا دانہ پتھر پر پھینک دیا جائے تو اس سے ایک گیہوں کا پودا نہیں اگ سکتا۔ گیہوں کا پودا تیار ہونے کے لیے ضرورت ہے کہ زمین کا اوپری حصہ ٹوٹ پھوٹ کر نرم مٹی کی شکل میں تبدیل ہو جائے ـــ جغرافیہ کا ہر طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ ٹھوس چٹان ویدرنگ (Weathering) اور ڈینوڈیشن (Denu-dation) کے بغیر نرم مٹی کی شکل اختیار نہیں کر سکتا لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ اس توڑ پھوڑ کے کام میں کتنے عوامل مثلاً گرمی، پالا، بہتا ہوا پانی، ہوا وغیرہ

مل کر کام کرتے ہیں تب کہیں زمین کی سطح پر نرم مٹی کے میدان بنتے ہیں جہاں گیہوں کی فصل لہلہاتی ہے۔ لیکن گیہوں کے اگنے کے لیے صرف مٹی ہی تو کافی نہیں ہے۔ اس کو نمی کی بھی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ ہماری زمین کا ۷۱ فی صدی حصہ پانی سے ڈھکا ہوا ہے۔ پانی کے چھوٹے چھوٹے ذخیروں کے علاوہ بحر اٹلانٹک (Atlantic Ocean) بحر پیسفک (Pacefic Ocean) اور بحر ہند (Indian Ocean) تین بڑے بڑے ذخیرے موجود ہیں۔ یہ سمندر اتنے گہرے ہیں کہ ساری خشکی کا علاقہ اس میں ڈبویا جا سکتا ہے۔ پیسفک (Pac-efic Ocean) تو اتنا گہرا ہے کہ اس میں ہمالیہ پہاڑ ڈبو یا جائے تو اسکی سب سے اونچی چوٹی ایورسٹ (Everest) جس کی اونچائی ۸۸۴۸ میٹر ہے، پانی میں بالکل غائب ہو جائے۔ لیکن گیہوں کی فصل تیار ہونے کے لیے اصل مسئلہ پانی کی موجودگی نہیں ہے بلکہ پانی کا ان ذخیروں سے نکل کر ہمارے کھیتوں تک پہونچنا ہے۔ چنانچہ سورج کی کرنوں میں یہ صلاحیت رکھ دی کہ وہ سمندر کے پانی کو خاموش طریقہ سے بھاپ میں تبدیل کرتا رہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح ہوا نے اربوں ٹن پانی اپنے کندھوں پر اٹھا لیا —— لیکن اصل مسئلہ اب بھی حل طلب ہی ہے کہ پانی سے لدی ہوئی ہوا ہمارے کھیتوں تک کیسے پہونچے؟

ہوا کے چلنے کے لیے زمین کی سطح پر ہوا کے کم دباؤ (Low - pressure) اور ہوا کے زیادہ دباؤ (High pressure) والے خطوں کا بننا ضروری ہے۔ چنانچہ مطلوبہ دباؤ پیدا کرنے کے لیے ہماری زمین اپنی کیل پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے گھوم رہی ہے اس گھماؤ کی وجہ سے مطلوبہ دباؤ تو ضرور پیدا ہو گیا لیکن ساتھ ساتھ ایک دوسرا خطرہ بھی پیدا

ہوگیا کہ زمین کی تیز رفتاری کی وجہ سے کہیں انسان الٹ پلٹ نہ ہو جائے۔ چنانچہ زمین کی سطح پر بڑے بڑے پہاڑ۔ ہمالیہ راکیز، اینڈیز اور آلپس کی شکل میں نصب کردیے گئے۔ تاکہ زمین میں توازن قائم ہو جائے۔ (وجعلنا فیھا رواسی ان تمیدبکم) یہی وہ حقیقت ہے جس کو جغرافیہ میں آیسٹسی (Isostasy) کہتے ہیں۔

اتنی قوتیں تو مٹی اور پانی مہیا کرنے پر لگی ہوئی ہیں۔ ابھی گیہوں کی فصل تیار ہونے تک بہت سے مراحل باقی ہیں اس کو آکسیجن (Oxygen) نائٹروجن (Nitrogen) کاربن ڈائی آکسائڈ (Carbon Dioxide) وغیرہ گیسوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے اس کو بہت سی معدنیات (Minerals) چاہیے۔ یہ پودا نہ مستقل دھوپ برداشت کرسکتا ہے اور نہ مستقلاً اندھیرے میں زندہ رہ سکتا ہے۔ اسی لیے رات اور دن کا نظام بنایا گیا تاکہ دن میں روشنی اور گرمی رہے اور رات میں خنکی۔

ہمارے خالق نے جب ایک دانہ گیہوں تیار کرنے میں اتنی قوتیں ہماری خدمت پر لگا رکھی ہیں تو ہماری لمبی چوڑی ضروریات کی فراہمی پر کتنی قوتیں لگی ہوئی ہوں گی؟ اتنی چیزیں ہماری خدمت پر لگی ہوئی ہیں کہ ہم ان کا شمار بھی نہیں کرسکتے (وان تعدوا نعمت اللہ لاتحصوھا) ان نعمتوں کا ذکر قرآن پاک میں مختلف مقامات پر آیا ہے۔ سورۂ لقمان کی آیت ۲۰ میں اسی احسان کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین و آسمان کی ساری چیزیں تمہارے لیے مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کردی ہیں۔"

اسی آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

" کھلی نعمتوں سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو آدمی کو کسی نہ کسی طرح محسوس ہوتی ہیں یا جو اس کے علم میں ہیں اور چھپی نعمتوں سے وہ نعمتیں مراد ہیں جنھیں وہ نہ جانتا ہے اور نہ محسوس کرتا ہے۔ بے حد و حساب چیزیں ہیں جو انسان کے اپنے جسم میں اور اس کے باہر دنیا میں اس کے مفاد کے لیے کام کر رہی ہیں مگر انسان کو ان کا پتہ تک نہیں ہے کہ اس کے خالق نے اس کی حفاظت کے لیے، اس کی رزق رسانی کے لیے، اس کی نشو و نما کے لیے اور اس کی فلاح کے لیے کیا کیا سر و سامان فراہم کر رکھا ہے سائنس کے مختلف شعبوں میں انسان تخلیق کے جتنے قدم آگے بڑھاتا جاتا ہے اس کے سامنے خدا کی بہت سی وہ نعمتیں بے نقاب ہوتی جا رہی ہیں جو پہلے اس سے بالکل مخفی تھیں اور آج تک جن نعمتوں پر سے پردہ اٹھا ہے وہ ان نعمتوں کے مقابلہ میں درحقیقت کسی شمار میں بھی نہیں ہیں جن پر سے پردہ نہیں اٹھا ہے"

(تفہیم القرآن جلد ۴ صفحہ ۲۰)

اسلام

حقیقت یہ ہے کہ بڑے بڑے سائنسدانوں نے خدا کا انکار کبھی نہیں کیا۔ اقرار کیا ہے یا پھر خاموش رہے ہیں۔ یہ کچے پکے سائنسداں تھے جو جوش

آکر خدا کا انکار کر بیٹھے۔ اب خود سائنس کی دنیا میں ایسے ایسے تجربات ہو رہے ہیں کہ خدا کا انکار ممکن نہیں رہا۔ اب جبکہ خود سائنس نے استنباطی طرز استدلال کو ایک اہم ذریعہ معلومات تسلیم کر لیا ہے تو حالات بالکل ہی بدل گئے ہیں۔ اب غیر سائنسدانوں کے مقابلہ میں سائنسداں کا خدا پر ایمان زیادہ مستحکم ہے۔ قرآن جو استنباطی طرز استدلال کا شاہ کار ہے خدا کے وجود پر انفس و آفاق سے ایسے دلائل پیش کرتا ہے کہ ایک معقولیت پسند انسان کے لیے خدا کا اقرار کیے بغیر چارہ نہ رہا۔۔۔ لیکن اصل مسئلہ خدا کے ہونے یا نہ ہونے کا نہیں ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسان دنیا میں زندگی کیسے گزارے اور کیا رویہ اختیار کرے جیسا کہ مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

"جب تک کہ خود اپنے بارے میں، ان موجودات کے بارے میں اور ان کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں کوئی رائے نہ قائم نہ کرلے کیا وہ اپنی زندگی کے لیے کوئی راستہ اختیار کر سکتا ہے؟ جب تک یہ طے نہ کرلے کہ میں کون ہوں۔ کیا ہوں۔ ذمہ دار ہوں یا غیر ذمہ دار۔ خود مختار ہوں یا ماتحت؛ ماتحت ہوں تو کس کا؟ اور جواب دہ ہوں تو کس کے سامنے؟ میری اس دنیوی زندگی کا کوئی مآل ہے یا نہیں؟ اور ہے تو کیا؟ ۔۔۔ اسی طرح کیا وہ اپنی قوتوں کے لیے کوئی مصرف تجویز کر سکتا ہے جب تک اس سوال کا فیصلہ نہ کرلے کہ یہ جسم اور جسمانی قوتیں اس کی اپنی ملک ہیں یا کسی کا عطیہ؟ ان کا حساب کوئی لینے والا ہے یا نہیں اور اس کے استعمال کا

ضابطہ اسے خود متعین کرنا ہے یا کسی اور کو؟ — اسی طرح کیا وہ اپنے گرد و پیش کی اشیاء کے متعلق کوئی طرزِ عمل اختیار کر سکتا ہے جب تک اس امر کا یقین نہ کرلے کہ ان اشیاء کا مالک وہ خود ہے یا کوئی اور؟ ان پر اس کے اختیارات محدود ہیں یا غیر محدود؟ اور محدود ہیں تو حدود مقرر کرنے والا کون ہے؟ — اسی طرح کیا وہ آپس میں اپنے ابنائِ نوع کے ساتھ برتاؤ کی کوئی شکل متعین کر سکتا ہے جب تک اس معاملہ میں کوئی رائے قائم نہ کرلے کہ انسانیت کس چیز سے عبارت ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان فرق و امتیاز کی بنیاد کیا ہے۔ اور دوستی اور دشمنی۔ اتفاق و اختلاف۔ تعاون اور عدم تعاون کی اساس کن امور پر ہے؟ — اسی طرح وہ بحیثیت مجموعی اس دنیا کے ساتھ کوئی رویہ اختیار کر سکتا ہے جب تک اس معاملہ میں کسی نتیجہ پر نہ پہونچے کہ یہ نظامِ کائنات کس قسم کا ہے اور اس میں میری حیثیت کیا ہے؟"

(اسلام اور جاہلیت صفحہ ۶-۷)

یہ سوالات انسانی زندگی کے بنیادی امور میں سے ہیں۔ کوئی نظام تمدن و تہذیب اور کوئی نظم اجتماعی اس وقت تک بن ہی نہیں سکتا جب تک ان سوالات کے بارے میں ایک رویہ نہ اختیار کر لیا جائے۔ جو شخص بھی دنیا میں زندگی گزار رہا ہے ان سوالات کے بارے میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک رائے ضرور رکھتا ہے۔ اور اس کی اہمیت اس قدر ہے کہ ان کے بارے میں صحیح رویہ اختیار کرنے پر زندگی صحیح رخ اختیار کرلیتی ہے اور غلط رویہ

اختیار کرنے پر غلط رخ پر مڑ جاتی ہے ـــــ ایک طرف یہ سوالات اس قدر اہم ہیں اور دوسری طرف اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ سب امور غیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا کوئی جواب افق پر لکھا ہوا نہیں ہے کہ ہر انسان دنیا میں آتے ہی اس کو پڑھ لے اور نہ اتنے واضح ہیں کہ ہر شخص کو خود بخود معلوم ہو جائے ـــ یہی وجہ ہے کہ ان کا کوئی ایک حل نہیں ہے جس پر سارے انسان متفق ہوں چنانچہ :۔

• ایک گروہ کا خیال ہے کہ چونکہ اس دنیا کا کوئی مالک نظر نہیں آتا اس لیے یا تو کوئی مالک ہے ہی نہیں یا اگر ہے بھی تو انسانی زندگی سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ دنیا خود بخود وجود میں آگئی ہے اور ایک دن خود بخود ختم ہو جائے گی نہ ہمارا کوئی پیدا کرنے والا ہے اور نہ ہم کسی کے آگے جواب دہ ہیں۔

• دوسرا گروہ کہتا ہے کہ خدا بہت سے ہیں سب مل کر پوری کائنات کو چلا رہے ہیں۔ محکمے بٹے ہوئے ہیں جس محکمہ سے آپ کی ضرورت وابستہ ہے اسکے خدا سے تعلق قائم کیجیے۔ پوجا پاٹ، نذر و نیاز کے ذریعہ ان خداؤں کو خوش کیا جا سکتا ہے لیکن ان خداؤں تک براہ راست رسائی ممکن نہیں ہے۔ بلکہ کچھ درمیانی ہستیاں ہیں جو ان تک پہونچنے کا ذریعہ ہیں مثلاً پیر و پروہت، پنڈت اور مولوی، بزرگوں کے مزار اور دیوی دیوتاؤں کے استھان وغیرہ۔

• کچھ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا اور یہ جسمانی وجود انسان کے لیے دارالعذاب ہے۔ انسان کی روح ایک سزا یافتہ قیدی کی حیثیت سے اس پنجڑے میں بند ہے۔ لذّات و خواہشات، اور تمام وہ ضروریات جو اس تعلق کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتی ہیں، اصل میں اس قیدخانہ کی بیڑیاں ہیں۔ انسان جتنا ہی اس دنیا میں دنیا کی چیزوں سے تعلق رکھے گا اتنا ہی

ان زنجیروں میں پھنستا چلا جائے گا اور مزید عذاب کا مستحق ہوگا۔ نجات کی صورت اس کے سوا کچھ نہیں کہ زندگی کے سارے بکھیڑوں سے قطع تعلق کیا جائے۔ خواہشات کو مٹایا جائے۔ لذات سے کنارہ کشی کی جائے۔ جسمانی ضروریات اور نفس کے مطالبات کو پورا کرنے سے انکار کر دیا جائے۔ اور ان تمام محبتوں کو دل سے نکال دیا جائے، جو گوشت اور خون کے تعلق سے پیدا ہوتی ہیں اور اپنے اس دشمن یعنی نفس اور جسم کو مجاہدوں اور ریاضتوں سے اتنی تکلیفیں دی جائیں کہ روح پر اس کا تسلط قائم نہ رہ سکے۔ اس طرح روح ہلکی اور صاف ہو جائے گی اور نجات کے بلند مقام پر اڑنے کی طاقت حاصل کرلے گی۔

- کچھ دوسرے لوگ اس نتیجہ پر پہونچے کہ انسان اور کائنات کی تمام چیزیں بجائے خود غیر حقیقی ہیں۔ ان کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے۔ دراصل ایک وجود نے ان ساری چیزوں کو خود اپنے ظہور کا واسطہ بنایا ہے اور وہی ان سب کے اندر کام کر رہا ہے۔ دراصل موجود وہی ہے باقی کچھ نہیں۔ انسان ایک کٹھ پتلی ہے جسے کوئی اور نچا رہا ہے یا جس کے اندر کوئی اور ناچ رہا ہے۔

یہ اور ایسے ہی بہت سے نظریات ہیں جن کو انسانوں نے بڑی محنت اور کاوش کے بعد تیار کیا ہے ان میں آپس میں بے حد تضاد ہے۔ یہ تضاد بالکل فطری ہے کیونکہ یہ امور غیب سے تعلق رکھتے ہیں اور غیب کے معاملات میں انسان کی رسائی نہیں۔ وہ ظن و گمان سے تو کام لے سکتا ہے لیکن حقیقت تک پہونچنا اس کے بس میں نہیں ہے۔ جیسا کہ مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں :-

"خالق ہی اپنی مخلوق کے بارے میں جان سکتا ہے۔ مخلوق اگر کچھ جانے گا تو خالق کے بتانے ہی سے جانے گا۔ اس کے پاس

خود اپنا ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے وہ حقیقت کو جان سکے۔"
(سیرت کا پیغام صفحہ ۶)

سیّد قطب شہیدؒ نے بھی یہی بات کہی ہے :۔

"انسان کو چاہیے کہ وہ مادّی دنیا میں اپنی عقل و علم اور مادّی صنعتوں میں اپنی مہارت سے فریب نہ کھائے۔ خواہ اس کی صلاحیتیں کتنی ہی کیوں نہ بڑھ جائیں اور اپنے بارے میں یہ سمجھنے لگے کہ اس نے اس میدان میں معجزے دکھلائے ہیں"
(اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل صفحہ ۴۰)

ڈاکٹر ایلکس کارل (Dr. Alexs Carrel) کا بھی یہی خیال ہے :۔

" انسان مادہ کے بارے میں وسیع علم کے باوجود خود اپنے بارے میں گمبھیر جہالت میں مبتلا ہے۔"

برگ سان (Bergson) کا قول ہے :۔

" عقل زندگی کی فہم سے طبعی طور پر عاجز ہے"

مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی فرماتے ہیں :۔

"عقل اس قابل بالکل نہیں ہے کہ صفات الٰہی کا مجمل ایمان حاصل ہو چکنے کے بعد ان کے تفصیلی تقاضوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ خود ہی کرلے۔" (اساسِ دین کی تعمیر صفحہ ۴۲)

خود اللہ تعالےٰ نے بھی قرآن میں یہی فرمایا ہے :۔

بعض ایسے ہیں جو علم کے بغیر اللہ کے بارے میں بحثیں کرتے ہیں" (الحج آیت ۳۰)

اسی سورہ میں چند آیات کے بعد اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :۔

"بعض لوگ ایسے ہیں جو کسی علم اور ہدایت اور روشنی بخشنے والی کتاب کے بغیر، ہی گردن اکڑاتے ہوئے خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں" (الحج آیت ۸۰)

جو چیزیں انسانی زندگی پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہیں وہ یہی ہیں کہ خدا کیا ہے؟ یہ کائنات کیا ہے؟ ہمارا خدا سے تعلق کیا ہے؟ کائنات کے اندر ہمارا مقام کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ — یہ سارے امور غیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے جن لوگوں نے ان امور کے بارے میں عقلی گدا لگایا ہے، حقیقت کو نہ پا سکے۔ عمل کے میدان میں یہ سارے نظریات بری طرح ناکام رہے۔ عقل کا فیصلہ یہی ہے کہ یہ سارے نظریات یقیناً غلط ہیں کیونکہ نظریہ اور عمل میں تال میل نہ ہو سکا۔

• جب انسان نے اس دنیا کو بے خدا مانا تو وہ غیر ذمہ دار، خودغرض، ظالم اور نفس پرست ہو گیا۔ کمزور کا استحصال (Exploitation) ہونے لگا۔ سیاست کی بنیاد حاکمیتِ انسان (Sovereignty of man) قرار پائی۔ کہیں ایک شخص یا خاندان یا ایک پارٹی یا ایک طبقہ یا پوری جنتا حاکمیت (Soverei-gnty) کے مقام پر پہونچ گئی۔ اس طرح اقتدار کے مقام پر وہ لوگ پہونچ گئے جو زیادہ طاقتور، چالاک، مکار، جھوٹے، خودغرض اور دغاباز تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قوم پرستی، امپیرلزم (Imperialism) جنگ، فساد، ملک گیری اور اقوام کشی جیسے کڑوے کسیلے پھل سامنے آئے۔

• جن لوگوں نے مانا کہ خدا بہت سے ہیں ان کے یہاں وہ ساری خرابیاں تو تھی ہیں جو خدا کو نہ ماننے کی صورت میں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی پوری زندگی ادہام کی آماجگاہ بن گئی۔ کہیں کسی قبر سے امید لگائے بیٹھے ہیں تو کہیں

کسی بت کے سہارے جی رہے ہیں۔ پوجا پاٹ، نذر و نیاز کے لمبے چوڑے دستور العمل میں لوگ الجھ گئے۔ چالاک لوگوں کے لیے عوام کو بے وقوف بنا کر لوٹنے کا بہترین موقع مل گیا۔ کہیں تعوید اور گنڈے، منتر اور عملیات کا ڈھونگ رچا کر لوگوں کی حاجتیں پوری کرنے کا یقین دلایا جا رہا ہے۔ تو کہیں کوئی پیر اور پروہت لوگوں کی مرادیں پوری کرنے کا دعویدار ہے۔ کچھ لوگ عوام اور خدا کے درمیان وسیلہ بن کر خود اپنی پوجا کرا رہے ہیں۔ پوری زندگی بتوں کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ یہی بت عزت اور دولت کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ بتوں پر لگنے والے میلے لین دین کا مرکز بن جاتے ہیں یہاں تک کہ حکومت کا حق بھی انہیں بتوں کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے۔ خود ہمارے ہندوستان میں سورج بنسی اور چندربنسی خاندانوں نے ایک عرصہ تک حکومت کی ہے۔ ان کا دعویٰ یہی تھا کہ وہ سورج یا چاند کی اولاد ہیں۔ یہاں تک کہ یہ بات ایک مسلّمہ حقیقت بن چکی تھی کہ بادشاہ "ایشور کا اوتار ہوتا ہے" یہ نظریہ عوام کے انتفاع (Exploitation) کا بہترین ذریعہ ثابت ہو چکا ہے

● جن لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ جسم اور یہ دنیا ایک قید خانہ ہے۔ ان کی عملی قوتیں سرد پڑ گئیں۔ ظالموں کے لیے نرم چارہ بن گئے۔ انسان کے سارے رجحانات اجتماعیت سے انفرادیت کی طرف، تمدن سے وحشت کی طرف پھر گئے۔ انسان ذمہ داریوں سے دور بھاگنے لگا۔ اس کی ساری زندگی عدم تعاون اور ترک موالات (Non co-operation) کی زندگی بن کر رہ گئی۔ نیک لوگ دنیا کے کاروبار سے ہٹ کر اپنی نجات کی فکر میں گوشۂ تنہائی اور جنگل اور پہاڑ کی طرف چل پڑے۔ اور دنیا کے سارے معاملات شریر لوگوں کے ہاتھوں میں چلے گئے۔

اللہ کے نبی

انسانی نظام حیات کے لیے دنیا کے مدبرین نے غور وفکر کے نتیجہ میں کچھ نظریات پیش کیے جن پر عمل کر کے دیکھا گیا تو نتیجہ غلط ہی نکلا۔ اس لیے ماننا پڑا کہ یہ سارے نظریات غلط تھے اور عقل کا بھی یہی کہنا ہے کہ ان نظریات کو غلط ہی ہونا چاہیے۔ اور مولانا مودودی صاحب کی بات ماننا پڑے گی:

"کوئی غیر نبی اگر نبی کا پیرو نہ ہو تو خواہ وہ کتنا ہی متبحر عالم، دانا اور فرزانہ ہو ہمارا رہنما نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان کے پاس حقیقت کا علم نہیں ہے اور جسے حقیقت کا علم نہ ہو وہ ہمیں کوئی برحق نظام نہیں دے سکتا۔" (سیرت کا پیغام صفحہ ۷۶)

ان مدبرین کے بالمقابل ایک گروہ "انبیاء" کا ہے جو ان بنیادی امور کے بارے میں واقف کار ہونے کا دعویٰ کرتا ہے ان کا کہنا ہے کہ ہماری معلومات قیاس اور گمان کی بنیاد پر نہیں ہیں۔ بلکہ خود دنیا کے خالق نے ہمیں یہ معلومات دی ہیں تاکہ ہم دنیا والوں تک یہ حقیقت پہونچا دیں۔ ان انبیاء کے بارے میں جتنی بھی چھان بین کی جاتی ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ سچے، ایماندار نیک، امین، انسانیت کے ہمدرد اور بے غرض لوگ تھے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کی بات کو نہ مانا جائے۔ خصوصاً جب انسان نے ان کے پیش کردہ نظریہ کے مطابق ان کے دئے ہوئے نظام حیات پر عمل کیا تو انکے بتانے کے مطابق ہی نتیجہ نکلا۔ فرد، معاشرہ اور ریاست تینوں کا بہترین نمونہ سامنے آیا۔ اب سائنٹیفک (Scientific) طریقہ یہی ہے کہ ان انبیاء کی فراہم کردہ معلومات کو تسلیم کیا جائے:۔

چنانچہ یہ بنیاء فرماتے ہیں :۔

یہ سارا عالم ہست و بود جو انسان کے گرد و پیش پھیلا ہوا ہے اور جس کا ایک جزو انسان بھی ہے کوئی اتفاقی ہنگامہ نہیں ہے بلکہ ایک منظم باضابطہ سلطنت ہے۔ اللہ نے اس کو بنایا ہے۔ وہی اس کا مالک ہے اور وہی اکیلا حاکم ہے۔ یہ ایک کُلی نظام (Totalitarian system) ہے جس میں تمام اختیارات مرکزی اقتدار کے ہاتھ میں ہیں اس مقتدر اعلیٰ کے سوا یہاں کسی کا حکم نہیں چلتا۔ تمام قوتیں جو اس نظام عالم میں کام کر رہی ہیں اسی کے زیر حکم ہیں اور کسی کی مجال نہیں کہ اس کے حکم سے سرتابی کر سکے یا اس کے اذن کے بغیر اپنے اختیار سے کوئی حرکت کرے اس ہمہ گیر سسٹم کے اندر کسی کی خود مختاری (Independence) اور غیر ذمہ داری (Irresponsibility) کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے نہ فطرتاً ہو سکتی ہے۔ انسان پیدائشی رعیّت (Born subject) ہے رعیّت کا ہونا اس کی مرضی پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ یہ رعیّت ہی پیدا ہوا ہے۔ اور رعیّت کے سوا کچھ اور ہونا اس کے امکان میں نہیں ہے۔ لہٰذا یہ خود اپنے لیے طریق زندگی وضع کرنے اور اپنی ڈیوٹی آپ تجویز کر لینے کا حق نہیں رکھتا۔ یہ کسی چیز کا مالک نہیں ہے کہ اپنی ملکیت میں تصرف کرنے کا ضابطہ خود بنائے اس کا جسم اور اس کی ساری قوتیں اللہ کی ملک اور اس کا عطیہ ہیں لہٰذا یہ ان کو خود اپنے منشا

کے مطابق استعمال کرنے کا حقدار نہیں ہے۔ بلکہ جس نے یہ چیزیں اس کو عطا کی ہیں اسی کی مرضی کے مطابق اسے ان کو استعمال کرنا چاہیے۔"

اسی طرح جو اشیاء اس کے گرد و پیش دنیا میں پائی جاتی ہیں، زمین، جانور، پانی، نباتات، معدنیات وغیرہ یہ سب اللہ کی ملک ہیں۔ انسان ان کا مالک نہیں ہے لہٰذا انسان کو ان پر بھی اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنے کا حق نہیں۔ بلکہ اسے ان کے ساتھ اس قانون کے مطابق برتاؤ کرنا چاہیے جو اصل مالک نے مقرر کیا ہے۔

اسی طرح وہ تمام انسان بھی جو زمین پر بستے ہیں اور جن کی زندگی ایک دوسرے سے وابستہ ہے اللہ کی رعیت ہیں۔ لہٰذا ان کو اپنے باہمی تعلقات کے بارے میں خود اصول اور ضابطے مقرر کرنے کا حق نہیں ہے۔ ان کے جملہ تعلقات خدا کے بنائے ہوئے قانون پر مبنی ہونے چاہئیں۔

رہی یہ بات کہ خدا کا قانون کیا ہے؟ تو پیغمبر کہتے ہیں کہ جس ذریعۂ علم کی بنا پر ہم تمہیں دنیا کی اور خود تمہاری حقیقت بتا رہے ہیں اسی ذریعۂ علم سے ہم کو خدا کا قانون بھی معلوم ہوا ہے۔ خدا نے خود ہم کو اس بات پر مامور کیا ہے کہ یہ علم تم تک پہونچا دیں۔ لہٰذا تم ہم پر اعتماد کرو ہمیں اپنے بادشاہ کا نمائندہ تسلیم کرو اور ہم سے اس کا مستند قانون لو۔

پھر پیغمبر ہم سے کہتے ہیں کہ جو تم بظاہر دیکھتے ہو کہ سلطنت

عالم کا سارا کاروبار ایک نظم کے ساتھ چل رہا ہے مگر نہ خود سلطان نظر آتا ہے نہ اس کے کارپرداز کام کرتے دکھلائی دیتے ہیں، اور یہ جو تم ایک طرح کی خود مختاری (Autonomy) اپنے اندر محسوس کرتے ہو۔ جس طرح چاہو کام کرو۔ مالکانہ روش بھی اختیار کر سکتے ہو۔ اور اصل مالک کے سوا دوسروں کے سامنے بھی اطاعت و بندگی ہیں سر جھکا سکتے ہو۔ ہر صورت میں تم کو رزق ملتا ہے۔ وسائلِ کار بہم پہونچتے ہیں اور بغاوت کی سزا فوراً نہیں دی جاتی۔ یہ سب دراصل تمہاری آزمائش کے لیے ہے۔ چونکہ تم کو عقل، قوتِ استنباط اور قوتِ انتخاب دی گئی ہے اس لیے مالک نے اپنے آپ کو اور نظام سلطنت کو تمہاری نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ وہ تمہیں آزمانا چاہتا ہے کہ تم اپنی قوتوں سے کس طرح کام لیتے ہو۔ اس نے تم کو سمجھ بوجھ، انتخاب کی آزادی (Freedom of Choice) اور ایک طرح کی خود مختاری (Autonomy) عطا کر کے چھوڑ دیا ہے اب اگر تم اپنی رعیت ہونے کی حیثیت کو سمجھو اور برضا و رغبت اس حیثیت کو اختیار کرو۔ بغیر اس کے کہ تم پر اس حیثیت میں رہنے کے لیے کوئی جبر ہو۔ تم اپنے مالک کی آزمائش میں کامیاب ہو گئے۔ اور اگر رعیت ہونے کی حیثیت کو نہ سمجھو یا سمجھنے کے باوجود باغیانہ روش اختیار کرو تو امتحان میں ناکام ہو جاؤ گے۔ اسی امتحان کی غرض سے تم کو دنیا میں کچھ اختیارات دیئے گئے ہیں۔ دنیا میں بہت سی چیزیں تمہارے قبضۂ قدرت

میں دی گئی ہیں۔ اور تم کو عمر بھر کی مہلت دی گئی ہے۔"
(اسلام اور جاہلیت صفحہ ۳۳-۳۰)

جس خدا نے انسان کو بہترین جسم، عمدہ صلاحیتیں اور مختلف قسم کی قوتیں دے کر اس دنیا میں بھیجا اور اس کی ساری ضروریات کا پورا پورا انتظام کیا ہے اس کے بارے میں یہ خیال کرنا بالکل عقل کے خلاف ہے کہ اس نے سب کچھ تو دیا لیکن زندگی گزارنے کا طریقہ ہی نہیں دیا جس سے خدا کی نعمتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا اور اس دنیا میں امن و سکون کی زندگی گزارتا ـــــ چنانچہ خدا نے اس کا بھی پورا پورا انتظام کیا۔ اس زمین پر پہلا انسان اللہ کا پہلا پیغمبر بھی تھا اسکو ایک مکمل نظام حیات بھی ملا تھا۔ پیغمبر کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی بہت دنوں تک انسان اسی نظام حیات کے مطابق زندگی گزارتا رہا۔ لیکن بعد میں دھیرے دھیرے وہ ساری چیزیں کتاب ہدایت سے خارج کردی گئیں جو لوگوں کی مرضی کے خلاف تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عرصہ کے بعد وہ نظام حیات بالکل تبدیل ہوگیا اور انسان گمراہی میں بھٹکنے لگا اور پوری زندگی میں فساد پھوٹ پڑا۔ تو خدا نے ایک دوسرے پیغمبر کے ذریعہ وہی ہدایت نامہ صحیح شکل میں دوبارہ بھیجا۔ جو لوگ سمجھ بوجھ رکھتے تھے اس کو فوراً قبول کیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کا کھویا ہوا نظام حیات ان کو دوبارہ مل گیا۔ لیکن جو لکیر کے فقیر تھے اپنے اسی تحریف شدہ نظام حیات سے چپکے رہے ـــــ اس طرح باربار اللہ کی طرف سے انسانوں کی رہنمائی کے لیے خدائی ہدایت نامہ آتا رہا۔ اور خود غرض انسانوں کے ہاتھوں تباہ ہوتا رہا۔ جیسا کہ مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں :-

"یہ پیغمبر مختلف قوموں اور ملکوں میں اٹھتے رہے۔ ہزارہا برس

تک ان کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ ہزار ہا کی تعداد میں وہ مبعوث ہوئے ان سب کا ایک ہی دین تھا یعنی وہ صحیح رویہ جو اول روز ہی سے انسان کو بتادیا گیا تھا۔ وہ سب ایک ہی ہدایت کے پیرو تھے یعنی اخلاق و تمدن کے وہ ازلی و ابدی اصول جو آغاز ہی میں انسان کے لیے تجویز کر دیے گئے تھے اور ان سب کا ایک ہی مشن تھا یعنی یہ کہ اس دین اور اس ہدایت کی طرف اپنے ابنائے نوع کو دعوت دیں۔ پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں ان کو منظم کر کے ایک ایسی امت بنائیں جو خود اللہ کے قانون کی پابند ہو اور دنیا میں قانونِ الٰہی کی اطاعت قائم کرنے اور اس قانون کی خلاف ورزی روکنے کے لیے جدوجہد کرے۔ ان پیغمبروں نے اپنے اپنے دور میں اپنے اس مشن کو پوری خوبی کے ساتھ ادا کیا مگر ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد تو ان کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ ہی نہ ہوئی اور جنھوں نے اسے قبول کر کے امت مسلمہ کی حیثیت اختیار کی وہ رفتہ رفتہ خود بگڑتے چلے گئے۔ حتی کہ ان میں سے بعض اس ہدایت الٰہی کو بالکل ہی گم کر بیٹھیں اور بعض نے خدا کے ارشادات کو اپنی تحریفات اور آمیزش سے مسخ کر دیا۔" (مقدمہ تفہیم القرآن صفحہ ۱۰-۹)

یہ سلسلہ برابر چلتا رہا یہاں تک کہ دنیا ترقی کی اس منزل میں داخل ہو گئی کہ دنیا کے مختلف حصوں تک اللہ کی دعوت کا پہونچانا آسان ہو گیا تو اللہ نے ایک آخری پیغمبر کو بھیجا تا کہ پوری دنیا کو ایک امت بنا دیا جائے۔ چنانچہ

حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری پیغمبر ہیں اور قرآن اللہ کی آخری کتاب ہے۔ لیکن آخری پیغمبر کے آنے سے قبل ہر پیغمبر نے اپنی اپنی قوم سے اس آخری پیغمبر کے بارے میں ذکر کیا ہے اور واضح پیشن گوئیاں بھی کی ہیں تاکہ لوگوں کو اس آخری پیغمبر کو پہچاننے میں دقت نہ ہو۔ چنانچہ آج کل جتنے مذاہب دنیا میں پائے جاتے ہیں ـــــ ان کی کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہر ایک کے یہاں ایک آخری نبی یا "انتم اوتار" کا تصوّر موجود ہے۔ یہودیوں کے یہاں یہ پیشن گوئیاں اس قدر واضح تھیں اور انھیں ان پر اس قدر یقین تھا کہ اپنے دشمنوں سے کہا کرتے تھے "ہمیں ستا لو آخری نبی کے آنے کا وقت آگیا ہے جب وہ آئیں گے تو ہم ایک ایک سے بدلہ لیں گے"، انھیں ان پیشن گوئیوں پر بالکل یقین تھا لیکن ساتھ ساتھ یہ غلط فہمی بھی کام کر رہی تھی کہ وہ آخری نبی کسی یہودی گھرانے میں پیدا ہوں گے۔

ہندو مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کل ۲۴، اوتار آئیں گے چنانچہ ۲۳ آچکے اور چوبیسویں کا انتظار ہو رہا ہے۔ وہ چوبیسواں اوتار آخری اوتار ہوگا اس کے بعد کوئی پچیسواں اوتار نہ ہوگا لیکن وہاں بھی یہی غلط فہمی موجود ہے کہ وہ آخری اوتار ہندوستان میں اور کسی ہندو گھرانے میں پیدا ہوں گے۔ اس آخری اوتار کے بارے میں پیشن گوئیوں پر مشتمل بھوشِ پُران (भविष्य पुराण) ایک پوری کتاب ہے۔ ہندو مذہبی کتابوں میں اس آخری نبی کے بارے میں جتنی صاف اور واضح پیشن گوئیاں موجود ہیں غالباً اتنی واضح کسی اور مذہبی کتاب میں نہ ہوں گی۔

پنڈت وید پرکاش اپادھیائے نے اس آخری اوتار کے موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ پنڈت جی سنسکرت کے ایم اے ہیں اور جرمنی سے

ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی ہے ۔ سنسکرت کے دو روپ ہوتے ہیں ویدک سنسکرت، اور لوکک سنسکرت، پنڈت جی اسی ویدک سنسکرت کے ایم اے ہیں جو وید کی خاص زبان ہے۔ اور وید، ہی انکی ریسرچ (Research) کا موضوع بھی رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب "کلکی اوتار اور محمد صاحب" میں اس موضوع پر پوری روشنی ڈالی ہے۔ اسی کتاب میں ایک سرخی (Reading) ہے۔ "ایک اوتار کے بعد دوسرا اوتار کب آتا ہے" وہ کون سے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جب دوسرے اوتار کی ضرورت پیش آتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے لکھا ہے کہ ہندو مذہبی کتابوں کی تعلیم کے مطابق ایک اوتار کے بعد دوسرا اوتار اسی وقت آتا ہے جب لوگ حقیقی مذہب سے دور ہو جاتے ہیں۔ مذہب میں غیر مذہبی باتیں گھل مل جاتی ہیں۔ دھرم کے نام پر ادھرم چل پڑتا ہے۔ مذہب اپنے بال بچوں کی شکم پروری تک محدود رہ جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ سولہ نکات پیش کیے ہیں اور یہ بھی بتلایا ہے کہ وید کی تعلیم کے مطابق آخری اوتار کے آنے کا وقت آچکا۔ اور ہم شدت سے اس آخری اوتار کا انتظار کر رہے ہیں اس لیے وہ ۱۶ نکات پورے ہو چکے جو ایک اوتار کے بعد دوسرے اوتار کے آنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ اور سارا مذہبی لٹریچر غیر معتبر ہو چکا ہے۔ دھرم اور ادھرم اس قدر گھل مل چکے کہ خدائی احکام اور انسانی کلام الگ کرنا ممکن نہیں رہا۔ آج کل جو کچھ دھرم کے نام پر چل رہا ہے وہ دھرم نہیں ہے۔ مذہبی کتابوں میں اس قدر تحریف (تبدیلی) ہو چکی ہے کہ اب وہ ناقابل اعتبار ہیں۔ اور مذہب کے بارے میں وہی معلومات صحیح مانی جائیں گی جو چوبیسواں اوتار پیش کرے گا۔

ڈاکٹر وید پرکاش اپادھیا ایم اے (سنسکرت وید) ڈی۔ فل، دھرم

شاستر، آچاریہ، ڈپ (جرمنی) کی دو کتابیں میری نظر سے گزری ہیں۔ (۱) کلکی اوتار اور محمد صاحب (۲) نراشنس اور انتم رشی یعنی ویدک نراشنس اور محمد صاحب۔ ان دونوں کتابوں کو "سارسوت ویدانت پرکاشن سنگھ الہ آباد" نے شائع کیا ہے۔ "کلکی اوتار اور محمد صاحب" نامی کتاب کے شروع میں آٹھ سنسکرت کے مشہور عالموں کے تصدیقی نوٹ ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ چوبیسویں اوتار جن کا انتظار کیا جا رہا ہے وہ محمدؐ صاحب ہی ہیں۔ ان کا لایا ہوا نظامِ حیات (دین) ہی اصل دینِ حق ہے اور جو دوسرے مذاہب آج دنیا میں پائے جاتے ہیں وہ سب اسی "دینِ حق" کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ جن لوگوں نے ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کیا ان کو صاف نظر آیا کہ حضرت محمدؐ کا لایا ہوا 'دین' کوئی نیا دین نہیں ہے بلکہ خود ان کے اپنے مذہب کا صحیح اور نیا ایڈیشن ہے۔

یہ ساری باتیں پنڈت جی نے الل ٹپ نہیں کہہ دی ہیں بلکہ وید، پُران، اور بھاگوت وغیرہ مذہبی کتابوں کو ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اور ان کو پورا یقین ہے کہ جس آخری رشی یا اوتار یا نبی کے آنے کی اطلاع ویدوں، بائیبل اور بودھک لٹریچر میں دی گئی ہے وہ حضرت محمدؐ ہی ہیں۔ چنانچہ "نراشنس اور انتم رشی" نامی کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"ویدوں میں، بائیبل میں، تتھا بودھ گرنتھوں میں انتم رشی کے روپ میں جس کے آنے کی گھوشنا کی گئی ہے وہ محمدؐ صاحب ہی سدھ ہوتے ہیں"

بہرحال یہ تفصیل تو انہی کتابوں کے مطالعہ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ مگر اس میں چند باتیں بہت زیادہ دل لگتی معلوم ہوتی ہیں:۔

• بھارتی دھرم گرنتھوں (مذہبی کتابوں) میں زمانہ کو چار یگ (युग) یعنی ادوار میں بانٹا گیا ہے (۱) ستیگ (सत्युग) (۲) تریتا یگ (त्रेतायुग) (۳) دواپر یگ (द्वापर युग) (۴) کلیگ (कलि युग) ان دھرم گرنتھوں میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ کلکی اوتار کلیگ میں کچھ مدت گزر جانے کے بعد پیدا ہوں گے۔ اور یہ بھی طے ہے کہ کلیگ آچکا اور اس کو آئے ہوئے تقریباً پانچ ہزار انہتر (5069) برس ہو چکے۔ اور حضرت محمدؐ کو بھی آئے ہوئے تقریباً ڈیڑھ ہزار برس ہو چکے ہیں۔ اس لیے "کلیگ میں کچھ مدت گزر جانے کے بعد" والی پیشینگوئی حضرت محمد صلعم کے بارے میں بالکل ٹھیک اترتی ہے۔

• کلکی اوتار کا زمانہ تلوار سے جنگ اور گھوڑوں کی سواری کا زمانہ ہوگا۔ اور خود کلکی اوتار اشو (گھوڑا) اور کھڑک (تلوار) کا استعمال کریں گے۔ جو لوگ آخری اوتار کے آنے کا ابھی انتظار کر رہے ہیں ان کے لیے یہ دونوں باتیں کافی غور طلب ہیں۔ آج گھوڑے کی سواری اور تلوار سے جنگ کا زمانہ نہیں رہا آج تو راکٹ اور میزائل کا زمانہ ہے —— آج سے چودہ سو برس قبل جب بارود کی بھی ایجاد نہیں ہوئی تھی تو یقیناً گھوڑے اور تلوار کا زمانہ تھا۔

• کلکی اوتار کے مقام پیدائش کے بارے میں "شنبھل گرام" کا نام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ پنڈت جی فرماتے ہیں کہ "شنبھل" مقام کا نام نہیں ہے بلکہ مقام کی صفت ہے۔ ہندوستان میں شنبھل نامی کوئی ایسا مقام نہیں ہے جہاں کوئی عالمی شہرت کا انسان پیدا ہوا ہو۔ اس لیے "شنبھل" ویشیشٹر (صفت ہے) نہ کہ نام شنبھل کے معنی ہیں "شانتی کا استھان" (دارالامن) —— مکہ جو

حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا مقام پیدائش ہے آج بھی دارالامن (شانتی کا استھان) کہا جاتا ہے۔

● مقام بعثت کے بارے میں پنڈت جی کی تحقیقات ہے کہ وہ آخری رشی یا اوتار ریگستانی خطّہ میں پیدا ہوں گے (अथर्ववेद 20/127/2) جہاں اونٹوں کا استعمال کثرت سے ہوگا ـــــ یہ بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ مکہ ریگستانِ عرب (Arabian Desert) میں واقع ہے۔

● مذہبی کتابوں میں کلکی اوتار کو جگت گرو (دنیا کا رہنما) کہا گیا ہے۔۔ قرآن محمد صلعم کو رحمتہؐ للعلمین (پوری دنیا کے لیے رحمت) کہتا ہے۔

● بھاگوت پران کے مطابق کلکی اوتار اس مقام کے ایک پروہت کے یہاں پیدا ہوں گے ـــــ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ حضرت محمد صلعم کا خاندان کعبہ کا متولی (پروہت) تھا۔

● ہندو مذہبی کتابوں میں کلکی اوتار کی والدہ کا نام "سوم وتی" یا "سومتی" بتلایا جاتا ہے۔ جس کے معنی ہیں "شانتی والی" یا "امن والی" حضرت محمد صلعم کی والدہ ماجدہ کا نام "آمنہ" تھا، جس کے معنی ہیں "امن والی" ـــ یا "شانتی والی"

● کلکی اوتار کے والد کا نام "وشنو یش" بتلایا جاتا ہے، جس کے معنی ہیں، "وشنو کا پالک" ـــــ حضرت محمد صلعم کے والد ماجد کا نام "عبداللہؓ" ہے جس کے معنی ہیں اللہ (وشنو) کا بندہ (پالک)

● کلکی اوتار کو "انتم اوتار" کہا گیا ہے ـــــ قرآن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین (انتم اوتار) کہتا ہے۔

● انتم اوتار اپنے چار ساتھیوں کے ذریعہ "کلی" (شیطان) کا نیوارن (خاتمہ)

کرے گا۔۔۔ حضرت محمد صلعم کے چار ساتھی تھے (۱) حضرت ابوبکرؓ (۲) حضرت عمرؓ (۳) حضرت عثمانؓ اور (۴) حضرت علیؓ۔ آگے چل کے چاروں خلیفہ ہوئے۔

کلکی اوتار کے بارے میں کہا گیا ہے کہ دیوتا دوارا (فرشتوں کے ذریعہ) ان کی مدد کی جائے گی۔۔۔ چنانچہ قرآن میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ بدر کی جنگ میں مسلمانوں کی مدد فرشتوں کے ذریعہ کی گئی۔

ویدوں میں بارہ پتنی (بارہ بیویوں) والے ایک شخص کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ جس کا نام "نراشنس" ہے۔۔۔ "محمدؐ" نراشنس کا عربی ترجمہ ہے (सायरा भाष्य करवेद समहिता ५-५२

کلکی اوتار کی یوم پیدائش کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "شوکل پکچھ دوادشی" کو پیدا ہوں گے۔ ہندی مہینوں کے دو حصے ہوتے ہیں۔ پہلی تاریخ سے ۱۴ تاریخ تک کو "شوکل پکچھ" کہا جاتا ہے اور ۱۵ سے مہینہ کے اخیر تک کو "کرشن پکچھ" کہا جاتا ہے۔ چنانچہ کلکی پران میں بتلایا گیا ہے کہ کلکی اوتار "شوکل پکچھ کی دوادشی" (۱۲) کو پیدا ہوں گے۔ مسلماوں کی تحقیقات کے مطابق حضرت محمد صلعم کا یوم پیدائش ۱۲ ربیع الاوّل ہے۔ اور تعطیلات کی فہرست میں بھی میلاد النبی کی تعطیل ۱۲ ربیع الاول ہی ہے۔ اس طرح یوم پیدائش کے معاملہ میں پیشین گوئی حضرت محمد صلعم کے بارے میں بالکل صحیح ہے۔

"کلکی اوتار اور محمد صاحب" اور "نراشنس اور انتم رشی" نامی کتابوں میں یہ بحث بہت لمبی ہے اور حقائق سے پُر ہے۔ وید، بھاگوت، پُران وغیرہ مذہبی کتابوں کی تعلیمات کی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب کو یقین ہے کہ حضرت محمد صلعم ہی وہ آخری اوتار ہیں جن کے بارے میں ہندو مذہبی کتابوں میں پیشین گوئی

کی گئی ہے۔

ڈاکٹر اپادھیا کا گہرا مطالعہ ہندو مذہبی کتابوں پر تو ہے ہی۔ ان کا مطالعہ اسلام، بودھ مت، عیسائی مت اور یہودی مت پر بھی اچھا خاصا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب "نراشنس اور انتم رشی" میں بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ جس آخری "بودھ" کے آنے کی پیشین گوئی کی گئی ہے اور ان کی جو خصوصیات بیان ہوئی ہیں وہ سب کی سب حضرت محمد صلعم پر پوری پوری چسپاں ہوتی ہیں۔ بہر حال تفصیلی معلومات تو ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کے مطالعہ ہی سے ہو سکتی ہے۔ "انجیل برناباس" میں یہ پیشین گوئیاں بہت ہی مفصل ہیں۔

ڈاکٹر اپادھیا اور دوسرے مذاہب کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت محمد صلعم ہی اللہ کے آخری پیغمبر ہیں اور دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے جس ہدایت اور رہنمائی کی ضرورت ہے وہ حضرت محمد صلعم ہی کی پیروی میں مل سکتی ہے۔

ہدایت کا ذریعہ حضرت محمد صلعم ہی کیوں؟

دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے جس علم کی ضرورت ہے وہ صرف اللہ کے پاس ہے۔ وہ علم اگر ہم کو مل سکتا ہے تو صرف اللہ ہی سے مل سکتا ہے اور یہ بھی کبھی نہیں ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے ایک کتابِ ہدایت چھاپ کر ہر شخص کے ہاتھ میں دیدی ہو تا کہ ہر شخص زندگی کے مراحل میں اس سے خود ہی رہنمائی لے لے۔ جس ذریعہ سے اللہ تعالےٰ انسانوں کی رہنمائی کرتا ہے

اس کا نام "وحی" ہے اور یہ وحی ہمیشہ انبیاء پر نازل ہوتی ہے ـــ زندگی کے مراحل میں ہدایت و رہنمائی کے لیے صرف ایک کتاب ہدایت ہی کافی نہیں ہے۔ اسی لیے کتاب کے ساتھ ساتھ ایک نبی بھی آتا ہے۔ اس کی ضرورت کی وضاحت خود قرآن ہی نے کردی ہے:-

"درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہیں میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے اور ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے"

(آلعمران آیت ۱۶۴)

جب انبیاء کی آمد کا مقصد محض الٰہی ہدایت کو پہونچا دینا نہیں ہے، بلکہ اس کی وضاحت کرنا۔ معانی و مطالب بتانا۔ اسلامی سماج کا ایک نقشہ پیش کرنا جس میں فرد، معاشرہ اور ریاست تینوں کے واضح اور تفصیلی ہدایت موجود ہوں، ایسے سماج کو وجود میں لانے کا طریقہ بھی دینا تاکہ آئندہ ایسا سماج بنایا جاسکے بگڑے ہوئے سماج کی طرف سے کیا کیا رکاوٹیں آتی ہیں اور اس سے نمٹنے کا طریقہ بھی شامل ہو تو محض کتابِ ہدایت سے یہ ساری ضرورتیں پوری نہیں ہوسکتیں۔ اس لیے انسان کو اس زمین پر خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے:۔

۱۔ الٰہی کتاب ہدایت، جو ہر طرح کی آمیزش سے پاک ہو۔ ایک زندہ زبان میں ہو جو ایک خطۂ زمین میں بولی جاتی ہو۔ تاکہ کتاب کو سمجھنا اس کے معانی و مطالب کی گہرائیوں میں اترنا۔ اصطلاحات کا صحیح مفہوم سمجھنا آسان ہو۔

۲۔ کتاب لانے والے کی سیرت پوری روشنی میں ہو۔ زندگی کی ساری

تفصیلات پوری صحت اور قابل اعتماد ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہو۔ پبلک اور پرائیوٹ زندگی، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے پہلو پوری روشنی میں ہوں۔ تاکہ ہر شعبۂ زندگی میں پوری رہنمائی مل سکے۔

ان دونوں پہلوؤں سے پچھلے انبیاء کے سلسلہ میں بالکل ہی مایوسی ہے۔ حضرت محمد صلعم کے علاوہ باقی سارے انبیاءؑ کی تعلیم اور ان کی سیرت کا کوئی معتبر ذخیرہ آج موجود نہیں ہے جو قابل اعتماد اور مستند ذریعہ سے ہم تک پہونچا ہو۔ نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، یوسف علیہم السلام وغیرہ بے شک اللہ کے نبی تھے اور ان پر اللہ کی کتاب اتری تھی لیکن آج نہ تو ان کی کتاب اصل شکل میں موجود ہے اور نہ ان کی زندگی کے حالات ہی محفوظ ہیں۔

یہودی کتابیں اور انبیاءؑ کہا جاتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے بعد آنے والے انبیاءؑ کی تعلیمات بائبل کے عہد عتیق (Old testament) میں موجود ہیں لیکن ان کا حال یہ ہے:۔

- موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل ہوئی تھی لیکن وہ اصل تورات چھٹی صدی قبل مسیح (600.B.C.) میں بیت المقدس کی تباہی میں ضائع ہوگئی اور اسی کے ساتھ ساتھ دوسرے انبیاءؑ کے صحیفے بھی ضائع ہوگئے جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد آئے تھے۔
- 500 B.C. میں جب بنی اسرائیل کا فلسطین پر دوبارہ قبضہ ہوا تو حضرت عزیر (Ezra) نے دیگر بزرگوں کی مدد سے موسیٰ علیہ السلام کی سیرت اور بنی اسرائیل کی تاریخ مرتب کی اور اسی میں تورات کی آیتیں بھی درج کردیں جو انھیں مل سکیں۔
- 400 B.C 200.B.C کے درمیان کچھ لوگوں نے ان انبیاءؑ کے

صحیفے تیار کیے جو ان سے صدیوں پہلے گزر چکے تھے۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ تیار کرنے والے کون لوگ تھے۔ اور ان کے ذرائع معلومات کیا تھیں۔

- 300-B.C. میں ایک شخص نے حضرت یونس علیہ السلام کے نام پر ایک کتاب لکھی جو بائیبل میں شامل ہے حالانکہ یونس علیہ السلام ۵۰۰ برس قبل گزر چکے تھے۔
- حضرت داؤد علیہ السلام کی وفات کے ۵۰۰ برس بعد زبور (Psalms) لکھی گئی اور اسی میں تقریباً ایک سو شاعروں کے کلام بھی درج ہیں
- امثالِ سلیمانی (Proverbs) سلیمان علیہ السلام کی وفات کے تقریباً ۷۰۰ برس بعد لکھی گئی اور اس میں بہت سے دوسرے حکمار کے اقوال بھی درج ہیں۔
- بحر مردار (Dead sea) کے قریب جو اسکرال (Scrolls) ملے ہیں وہ (200B-C) کے لکھے ہوئے ہیں وہ بھی چند منتشر اجزا رہیں۔
- بائیبل کی ساری کتابیں عبرانی زبان میں تھیں جو ۷۰ء کی بیت المقدس کی تباہی میں ضائع ہوگئیں اور ان کا صرف وہ یونانی ترجمہ باقی رہ گیا جو 258 B.C. میں کیا گیا تھا۔
- ۱۰۰ء میں یہودی علماء نے بچے کھچے مسودات کی مدد سے ایک عبرانی بائبل کا نسخہ تیار کیا۔ اس کا بھی قدیم ترین نسخہ جواب پایا جاتا ہے ۹۱۶ء کا لکھا ہوا ہے۔
- 300B-C-200B-C کے درمیان جو یونانی ترجمہ کیا گیا وہ غلطیوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور اسی ترجمہ سے ۲۰۰ء اور ۳۰۰ء کے درمیان لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔

یہودیوں کے یہاں کچھ سینہ بسینہ روایات بھی پائی جاتی ہیں جن کو Oral Laws کہتے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے ۱۳ ۱۴ سو برس تک یونہی زبانی چلتے رہے اور دوسری اور تیسری صدی کے درمیان مشنا (Mish - nah) کے نام سے کتابی شکل میں آئیں۔ جس کی ایک شرح فلسطینی علماء نے حلقہ (Halakn) کے نام سے دوسری شرح بابلی علماء نے (Haggadah) کے نام سے شائع کیا۔ انھیں تینوں کتابوں کے مجموعے کا نام تلمود ہے۔

یہودی قوم دنیا کی سب سے زیادہ پڑھی لکھی اور دولت مند قوم ہے۔ ان کو اپنے مذہب سے بھی بہت زیادہ لگاؤ ہے۔ انہوں نے اپنے مذہبی سرمایہ کو محفوظ کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ پھر بھی یہ ہے ان کا مذہبی سرمایہ۔ ان میں بھی جو باتیں موسیٰ علیہ السلام یا دوسرے انبیاء بنی اسرائیل کی طرف منسوب کی گئی ہیں کسی کی بھی سند انبیاء تک نہیں پہونچتی۔ اور یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ ان چیزوں کو بعد والوں تک منتقل کرنے والے کون تھے۔

یہ ہے یہودی مذہب میں خدائی ہدایت کا حال۔ آج کے ایٹمک دور میں کھلے دل و دماغ سے سوچنے والا انسان کیسے مطمئن ہو سکتا ہے کہ جو مذہبی لٹریچر الٰہی ہدایات کے نام سے یہودیوں کے یہاں ہے وہ وہی ہے جو کبھی خدا کی طرف سے نازل ہوا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دینِ نصاریٰ کی کتابیں

عیسیٰ علیہ السلام پر جو انجیل اتری تھی اس کو انہوں نے لوگوں کو زبانی ہی سنایا۔ اس طرح ایک سے دوسرے تک زبانی ہی منتقل ہوتی رہی یہاں تک کہ عیسیٰ علیہ السلام کے حالات اور انجیل کی آیات آپس میں خلط ملط ہو گئیں۔ ان میں سے کوئی چیز عیسیٰؑ کے

وقت میں نہیں لکھی گئی۔ بعد کے علماء نے ان کو یونانی زبان میں لکھا حالانکہ عیسیٰؑ اوران کے شاگردوں کی زبانی سریانی (Syriac) یا آرامی (Aramaic) تھی اور وہ بھی ۳۰۰ء سے قبل نہیں لکھی گئی۔

- ان کتابوں میں کسی چیز کی سند عیسیٰ علیہ السلام تک نہیں پہونچتی۔ اور نہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتیں کس نے کس سے سنا۔ یہ کتابیں بھی اب محفوظ نہیں ہیں۔
- عہد نامہ جدید (New Testament) کے ہزاروں نسخے جمع کیے گئے لیکن ان میں کوئی بھی ۳۵۰ء سے قبل کا نہ ملا بلکہ اکثریت تو ۱۰۰۰ء تک کی ہے۔
- یونانی زبان سے لاطینی زبان میں ترجمہ کس نے کیا؟ کب کیا؟ اور کہاں کیا؟ کچھ پتہ نہیں۔
- ۳۸۰ء میں پوپ کے حکم سے اس پر نظر ثانی کی گئی۔
- ۱۶۰۰ء میں یونانی زبان سے لاطینی زبان میں ایک نیا ترجمہ کیا گیا۔
- ۲۰۰ء میں چاروں انجیلوں کا ترجمہ یونانی زبان سے سریانی زبان میں ہوا۔ لیکن اس کا بھی قدیم ترین نسخہ ۴۰۰ء کا ہے۔ جو نسخہ ۵۰۰ء میں ہاتھ کا لکھا ہوا ملا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔
- تقریباً ۷۰ انجیلیں لکھی گئی تھیں۔ لیکن دین مسیح کے پیشواؤں نے ان میں سے صرف ۴ کو قبول کیا اور بقیہ کو رد کر دیا گیا۔ لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ قبول کیا تو کیوں؟ اور رد کیا تو کیوں؟

بودھ مذہب دنیا کی مشہور شخصیتوں میں مہاتما بدھ بھی ہیں، جن کے بارے میں گمان کیا جاسکتا ہے کہ شاید یہ بھی نبی رہے ہوں گے۔ مگر انھوں نے سرے سے کوئی کتاب پیش ہی نہیں کی اور نہ ان کے پیروؤں

کو کبھی یہ دعویٰ رہا ہے کہ وہ کوئی کتاب لائے۔ ان کی ساری تعلیم زبانی ہے۔ ان کی وفات کے ایک سو سال بعد ان کے اقوال اور حالات کو جمع کرنے کا کام شروع ہوا۔ جتنی کتابیں بدھ مذہب کی اصل کتابیں سمجھی جاتی ہیں، ان میں کسی میں بھی کوئی سند نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ کن ذرائع سے مہاتما بدھ کے اقوال و افعال ان تک پہونچے ہیں۔

ہندو مت

"ہندو مت کسی ایک مذہب کا نام نہیں ہے اور نہ "ہندو" کسی ایک ملت کا۔ ہندوؤں میں مختلف فرقے ہیں اور ہر فرقے کا مذہب دوسرے سے مختلف ہے۔ ان مذاہب کے ماخذ بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ماخذ کے لحاظ سے ہم ہندوؤں کو دو گروہوں میں بانٹ سکتے ہیں۔ ایک وہ جو 'وید' کو اپنے مذہب کا ماخذ نہیں مانتا۔ دوسرا وہ جو ویدوں پر ایمان رکھتا ہے پہلے گروہ کے موجودہ معروف فرقے سکھ، بدھ، اور جین ہیں سکھوں کی مقدس مذہبی کتاب 'وید' کے بجائے "گرو گرنتھ صاحب" ہے جس میں گورو نانک اور دوسرے سکھ گروؤں کے ارشادات جمع کر دیے گئے ہیں۔

بدھ بھی 'وید' کے بجائے گوتم بدھ اور ان کے بعد کے بدھ پیشواؤں کی تعلیمات کو اپنے مذہب کا ماخذ مانتے ہیں۔ جین مت کی کتابوں کی فہرست خاصی طویل ہے اور ہمارے علم کی حد تک ان میں کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں ہے جسے عام ہندو بھی تسلیم کرتے ہوں۔" (ہندو مت اور توحید ۲۱)

وید:- وید ہندوؤں کی مقدس مذہبی کتاب ہے جیسا کہ سوامی ویویکانند فرماتے ہیں :-

"ہم سب ویدوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور انہیں مذہبی اسرار و رموز کی ازلی و ابدی تعلیمات باور کرتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اس مقدس لٹریچر کا نہ کوئی آغاز ہے اور نہ کوئی انجام" ..... ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ ہمارے تمام روحانی اختلافات کے لیے اپیل کی آخری عدالت یہی (مقدس کتاب) ہے۔

(Hinduism- Its Common Basis Page 44-47)

سوامی ویویکانند دوسری جگہ فرماتے ہیں :-

"ہمارا ایمان ہے کہ اس مقدس لٹریچر کا نہ کوئی آغاز ہے اور نہ انجام"

مہاتما گاندھی جی فرماتے ہیں :-

"وید، اپنشد، سمرتی، پُران اور اتیہاس ایک ہی وقت میں سامنے نہیں آئے ان میں سے ہر ایک کا ارتقاء مخصوص ادوار کی ضرورتوں کی بنیاد پر ہوا۔ اور اسی واسطے ان میں باہم ٹکراؤ محسوس ہوتا ہے۔ یہ کتابیں از سرِ نو ازلی و ابدی صداقتوں کا اظہار نہیں کرتی ہیں بلکہ یہ ظاہر کرتی ہیں کہ ان صداقتوں پر اس دور میں کس طرح عمل ہوتا تھا جس دور کی یہ کتابیں ہیں۔ کیونکہ جانوروں کی قربانی کا عمل ایک زمانہ میں عام تھا کیا آج ہم اسے از سرِ نو زندہ کرنا چاہتے ہیں؟ کیونکہ ایک زمانہ میں

ہم گوشت کھاتے تھے۔ کیا آج بھی ہم ایسا کرنا چاہتے ہیں؟۔

(Hindu Dharma page 19)

ڈاکٹر رادھا کرشنن فرماتے ہیں:۔

"وید کے منتر بہرحال اس وقت مرتب کیے گئے تھے جب ہندوستانی ایرانیوں سے جدا ہو چکے تھے اور ان منتروں کی تخلیق کے وقت ان کا وطن سندھ کا علاقہ تھا"

(Religion And Society Page-119)

برہمانڈ پران میں ہے:۔

"پران برہما کے منہ سے اس وقت سنے گئے جبکہ ابھی وید ان کے چار منہ سے نہ نکلے تھے"

(The cultural Heritage of India P. 170)

سوامی شروانند اسسٹنٹ سیکریٹری رام کرشن مٹھ اینڈ مشن فرماتے ہیں:۔

"اندرونی شہادت سے بھی ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ دوسرے "سمہتاؤں" (ویدوں) میں رگ وید کے بعض حصوں کو کم و بیش کر کے اور بڑا کر کے بیان کر دیا گیا ہے۔ یجر وید اور سام وید معمولی اضافوں اور تبدیلیوں کے ساتھ رگ وید کے قابل لحاظ حصہ پر مشتمل ہیں۔۔۔۔ اتھروید جو سب سے آخری وید ہے اس میں بھی رگ وید کے بہت سے منتر ہیں"

(The cultural heritage of India page 4-5)

گیتا میں بھی صرف تین ویدوں رگ وید، یجر وید، اور سام وید کا ذکر ہے۔

سوامی شرواننداسسٹنٹ سیکریٹری رام کرشن مٹھ اینڈ مشن فرماتے ہیں:۔

"ویدوں کو"سرتی" اس لیے کہا جاتا ہے کہ انہیں جاننے اور حفظ کرنے کا روایتی طریقہ یہ تھا کہ انہیں استاد سے گاتے ہوئے سنا جائے۔" (The cultural heritage Oi India page 5)

گاندھی جی فرماتے ہیں:۔

"میں اپنے کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں ویدوں، اپنیشدوں پرانوں اور ان تمام کتابوں پر ایمان رکھتا ہوں جنہیں ہندو مقدس کتب کہا جاتا ہے۔"

دیوان بہادر کے۔ایس۔ رام سوامی شاستری فرماتے ہیں:۔

"یہ واضح ہے کہ پران ہندوؤں کی مقدس کتب کا نہایت اہم اور ناگزیر حصہ ہیں وہ بنیادی طور سے ویدوں میں بیان کی ہوئی روحانی صداقتوں کی توسیعات اور انکی تمثیلی تشریحات ہیں۔" (The puranas and their contribution to indian Thoughts)

اے۔ڈی۔پسالکر فرماتے ہیں:۔

"پران ہندوؤں کے مذہبی و غیر مذہبی لٹریچر میں یکتا مقام رکھتے ہیں۔ اہمیت کے اعتبار سے ویدوں کے بعد ہی ان کا مقام سمجھا جاتا ہے اور مہابھارت کی طرح انہیں 'پانچواں وید' عوام کا وید' اور اتنا ہی قدیم اور مقدس خیال کیا جاتا ہے جتنے خود وید ہیں۔" (Indian Inheritanc Page 75)

دیانند سرسوتی پرانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"ان میں اگر ایک بات سچی مانیں تو دوسری جھوٹی اور اگر دوسری سچی مانیں تو تیسری جھوٹی اور اگر تیسری سچی تو اور سب جھوٹی ثابت ہوتی ہیں" (ستیارتھ پرکاش)

سوامی دیویکانند ویدک قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"وہ قربانی کی ایک چتا بناتے۔ کچھ جانوروں کو ذبح کرتے۔ ان کا گوشت سیخوں پر بھونتے اور یہ گوشت اندر پر چڑھا دیتے"

(Hinduism Page 19)

ڈاکٹر تاراچند فرماتے ہیں:۔

"ویدک قربانیوں میں جانوروں کے چڑھاوے کی طرح پھل، دودھ اور چاول کی روٹیاں شامل ہیں (بعد میں) جانوروں کی قربانی مذہبی اعمال سے غائب ہوگئی"

(The Influence of islam on Indian culture Page 3)

یہ چند اقتباسات ہندو مذہب کی ان عظیم شخصیتوں کے ہیں جن کا ہندو مذہب میں ایک مقام ہے۔ ان اقتباسات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وید قدیم خدائی کتابوں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متعین طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ وید کب نازل ہوئے۔ بلکہ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ کیسے نازل ہوئے؟ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ چاروں وید برہما کے چار منہ سے نکلے۔ دوسروں کا کہنا ہے کہ وید رشیوں پر الہام ہوئے تھے تو ظاہر ہے کہ یہ پتہ لگانا تو اور بھی مشکل ہے کہ وہ رشی کون تھے جن پر یہ وید نازل ہوئے تھے بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ

چاروں وید ایک ہی وقت میں نازل ہوئے تھے ۔جبکہ دوسروں کا کہنا ہے کہ چاروں وید مختلف زمانوں میں نازل ہوئے تھے۔کچھ لوگ کہتے ہیں اصل وید 'رگ وید' ہے بقیہ دوسرے وید اسی کی تشریح اور اضافہ ہیں جبکہ بعض کا خیال ہے کہ 'وید' اصل میں تین ہیں رگ وید' ۔یجر وید' اور سام وید' چوتھا وید انہیں منتروں پر مشتمل ہے جو پہلے تینوں میں آچکے ہیں۔ اور کچھ لوگ کہتے ہیں چاروں وید مستقل وید ہیں۔ ان میں سے کسی کے پاس کوئی اٹل اور تحریری دلیل نہیں ہے۔ بلکہ سب کے خیالات ظن و گمان پر مبنی ہیں۔ شروع میں وید تحریری شکل میں نہ تھے ۔ بلکہ زبانی ہی چلتے رہے۔ استاد ان کو گاتے تھے اور شاگرد ان کو سن کر یاد کر لیتے تھے ۔ اسی لیے ان ویدوں کو "سرتی" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ وید کب تحریری شکل میں آئے اور ان کو مرتب کرنے والا کون تھا کچھ پتہ نہیں ،کہا جاتا ہے کہ 'دواپریگ' میں 'کرشن دوئے پاٹن' نے ویدوں کو ازسرِ نو مرتب کیا ۔ اسی لیے ان کو 'وید ویاس' ویدوں کا مرتب کرنے والا کہا جاتا ہے ۔ ایک طویل مدت تک یہ وید زبانی ہی چلتے رہے ،اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ویدوں کا بہت سا حصہ گم ہو گیا اور بقیہ آپس میں گڈ مڈ ہو گیا۔ جب یہی پتہ نہیں کہ اصل وید کتنا تھا تو یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ کونسا حصہ گم ہو گیا۔

ہندوؤں کی اکثریت "پرانوں" کو پانچواں وید' کہتی ہے اور پران پر اپنے ایمان کا دعویٰ کرتی ہے۔ مولانا حامد علی صاحب جن کا ہندو مذہبی کتابوں کا گہرا مطالعہ ہے اور اس موضوع پر بہت سی قیمتی کتابیں تصنیف کی ہیں فرماتے ہیں :۔

"ہندو اہل علم ہی نہیں خاص الخاص محققین بھی ان پرانوں پر ایمان رکھتے ہیں۔" (ہندو مت اور توحید صفحہ ۳۴)

دوسری طرف ہندوؤں کا ایک چھوٹا سا فرقہ جس کو "آریہ سماج" کہتے ہیں، ان پُرانوں کو "من گھڑت گپوڑ" کہتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ وید الہامی کلام ہے۔ الہامی کلام کے معنی تو یہ ہیں کہ اگر یقین ہو جائے کہ یہ وید کا کلام ہے تو اس کے آگے سر اطاعت جھکانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ لیکن وید کو الہامی کلام ماننے کے باوجود اس کے پیچھے چلنے کے بجائے اس کو اپنی مرضی کے پیچھے چلایا جا رہا ہے۔ مثلاً جانوروں کی قربانی کا معاملہ ہے۔ گاندھی جی خود لکھتے ہیں کہ وید میں جانوروں کی قربانی کا حکم ہے لیکن پھر خود ہی کہتے ہیں:۔

"جانوروں کی قربانی کا عمل ایک زمانہ میں عام تھا۔ کیا آج بھی ہم اس کو از سر نو زندہ کرنا چاہتے ہیں! ایک زمانہ میں ہم گوشت کھاتے تھے۔ کیا آج بھی ہم ایسا کرنا چاہتے ہیں؟"

یہ سارے اختلافات اور تضاد محض اس لیے ہیں کہ وید اتنے قدیم ہیں کہ انکی صحت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وید کس رشی پر نازل ہوئے؟ کب نازل ہوئے؟ کچھ پتہ نہیں۔ یہ ہم تک کیسے پہنچے؟ اس کی کوئی سند نہیں ہے۔

ایک شخص کہتا ہے کہ "بنارس میں گنگا ندی کا پل ٹوٹ کر دریا میں گر گیا" اس خبر پر کسی کو یقین نہیں آ سکتا کیونکہ یہی پتہ نہیں کہ اس شخص تک خبر لانے والا کون ہے؟ اور خود اس کو کیسے معلوم ہوا؟

دوسرا شخص کہتا ہے کہ مجھے "A" نے کہا اور "A" سے "B" نے کہا اور "B" سے "G" نے کہا کہ "میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ بنارس میں گنگا ندی پر بنا ہوا لوہے کا پل ٹوٹ کر دریا میں گر گیا" اگر خبر کے درمیانی واسطے "A-B" اور "G" قابل اعتماد ہیں تو خبر کو ہر شخص

جان لے گا کیونکہ پہلا طریقہ غیر سائنٹیفک ہے جبکہ دوسرا سائنٹیفک ہے۔ ان درمیانی اشخاص کو جو واقعہ تک پہونچنے کا ذریعہ ہیں "سند" کہتے ہیں سائنٹیفک دور کا انسان سند کے بغیر بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔

قرآن مجید حضرت محمد صلعم اللہ کے آخری نبی ہیں جو کتاب "وحی" کے ذریعہ آپ پر نازل کی گئی اس کا نام "قرآن" ہے۔ حضرت محمد صلعم نے قرآن کو اس دعویٰ کے ساتھ پیش کیا کہ یہ اللہ کا کلام (Work of God) ہے جو مجھ پر نازل کیا گیا ہے۔ جائزہ لینے پر یقینی طور پر محسوس ہوتا ہے کہ اس میں کوئی آمیزش نہیں ہوئی ہے۔ خود حضرت محمد صلعم کا اپنا قول بھی اس میں شامل نہیں ہے۔ اس کو بالکل ہی الگ رکھا گیا ہے۔ اس کتاب کے اندر اللہ کے سوا کسی اور کا ایک لفظ بھی شامل نہیں ہے۔ جو کلام رسول اللہ صلعم پر نازل ہوا تھا اس میں نہ ایک حرف بڑھایا گیا ہے اور نہ گھٹایا گیا ہے — یہ محض خالی خولی دعویٰ نہیں ہے بلکہ جس طرح اس کی حفاظت کا انتظام کیا گیا ہے ہر معقول شخص کو مطمئن کرنے کے لیے بالکل کافی ہے۔

● یہ کتاب پوری کی پوری ایک وقت میں نازل نہیں ہوئی بلکہ تھوڑا تھوڑا کرکے ۲۳ سال میں پوری ہوئی۔ یہ کتاب جس وقت سے نازل ہونا شروع ہوئی اسی وقت سے رسول اللہ صلعم نے اس کو لکھوانا شروع کردیا۔ جب کوئی وحی آتی اسی وقت کسی کاتب کو بلا کر اسے لکھوا دیتے۔ لکھنے کے بعد وہ آپ کو سناتا۔ جب آپ اطمینان کرلیتے کہ کاتب نے اسے صحیح لکھا ہے تو اسے ایک محفوظ جگہ رکھ دیتے۔ یہی نہیں بلکہ نازل شدہ وحی کے متعلق یہ ہدایت بھی فرما دیتے کہ اسے کس سورہ میں اور کس آیت کے قبل یا بعد درج کیا جائے اس طرح ساتھ ساتھ ترتیب بھی دیتے رہتے۔ یہاں تک کہ قرآن مکمل ہوگیا۔

• آغازِ اسلام ہی سے نماز میں کچھ نہ کچھ قرآن پڑھنا لازمی تھا۔ اس لیے ایک مسلمان کے لیے خواہ وہ عربی زبان سے واقف ہو یا نہ ہو قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ زبانی یاد کرنا ضروری ہے تاکہ نماز میں پڑھ سکے۔ صحابہ کرام میں بہتوں کو پورا قرآن زبانی یاد تھا۔ اور اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جنھیں قرآن کا بیشتر حصہ یاد تھا۔

• ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مسلمانوں کی مادری زبان عربی نہیں ہے۔ پھر بھی کوئی ضلع ایسا نہ ہوگا جہاں ہزار پانچ سو لوگ ایسے موجود نہ ہوں جن کو پورا قرآن زبانی یاد ہو۔ انہیں کو "حافظ" کہتے ہیں۔ رمضان کے مہینہ میں تراویح میں حافظ پورا قرآن پڑھتا ہے۔ پیچھے نماز پڑھنے والوں میں "حافظ" ہوتے ہیں۔ ذرا سی بھی غلطی ہوتی ہے تو فوراً ٹوک دیتے ہیں۔

• قرآن رسول اللہ صلعم کے سامنے ہی مکمل ہو چکا تھا۔ جن صحابہ نے خود لکھ لیا تھا، رسول اللہ صلعم کو سنا کر اس کی صحت کا اطمینان کر لیا تھا۔

• صحابہ کرام کی ایک پوری جماعت موجود تھی۔ جو وحی الٰہی کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ جیسے ہی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی ہے۔ لوگ آکر سنتے۔ بہت سے لوگ زبانی یاد کر لیتے۔ جو لکھنا جانتے تھے خود بھی لکھ لیتے — عربوں کو اپنی زبان دانی پر ناز تھا۔ فصیح و بلیغ کلام کی بڑی قدر ہوتی تھی۔ قرآن کا معیار فصاحت و بلاغت اتنا بلند ہے کہ کوئی انسانی کلام آج تک اس معیار تک نہ پہونچ سکا — جو اردو غالب اور میر کے زمانہ میں بولی جاتی تھی وہ آج نہیں ہے۔ جو انگریزی شیکسپیر اور ملٹن کے زمانہ میں رائج تھی آج مقبول نہیں ہے۔ یہی حال دوسری زبانوں کا بھی ہے لیکن عربی زبان کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اس نے

فصاحت و بلاغت کا وہ معیار قائم کر دیا کہ آج تک کوئی انسانی کلام اس معیار تک پہونچا ہی نہیں اس لیے جو عربی آج سے ڈیڑھ ہزار برس قبل تھی وہی آج بھی ہے۔ قرآن نے عربی کا وہ اونچا معیار قائم کر دیا کہ باوجود کوشش کے آج تک کوئی شخص اس معیار تک نہ پہونچ سکا۔ قرآنی عربی میں وہ جاذبیت تھی کہ مسلمان تو مسلمان کفار جو قرآن کے سخت مخالف تھے قرآن کو چھپ چھپ کر سننے پر اپنے کو مجبور پاتے تھے۔

خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے تمام حفاظ کو جمع کیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خود کا تیار کیا ہوا نسخہ منگوایا۔ اور صحابہ میں جن جن کے پاس اپنا قرآن موجود تھا منگایا۔ سب کی مدد سے ایک مکمل نسخہ کتابی شکل میں تیار کیا گیا۔

حضرت عثمان رضؓ خلیفہ ثالث کے زمانہ میں اسی قرآن کی نقلیں سرکاری طور پر دنیائے اسلام کے مرکزی مقامات پر بھیجی گئیں۔ ان میں سے دو نسخے آج بھی موجود ہیں ایک تاشقند میں اور دوسرا استنبول میں۔ جیسا کہ مولانا مودودی صاحب نے لکھا ہے:۔

"ان میں سے دو نقلیں آج بھی موجود ہیں ایک استنبول میں اور دوسری تاشقند میں۔ جس کا جی چاہے۔ قرآن مجید کا کوئی مطبوعہ نسخہ لے کر اس سے ملالے۔ کوئی فرق نہ پائے گا۔ اور فرق ہو کیسے سکتا ہے۔ جبکہ رسول اللہ صلعم کے زمانہ سے لے کر آج تک ہر پشت (Generation) میں لاکھوں اور کروڑوں حافظ موجود رہے ہیں۔ ایک لفظ بھی اگر کوئی شخص بدل دے تو یہ حفاظ اس کی غلطی پکڑ لیں گے۔ پچھلی

صدی کے آخر میں میونک یونیورسٹی کے ایک انسٹی ٹیوٹ نے دنیائے اسلام کے مختلف حصوں سے ہر زمانہ کے لکھے ہوئے قرآن مجید کے قلمی اور مطبوعہ بیالیس ہزار (42,000) نسخے جمع کیے تھے۔ پچاس سال تک ان پر تحقیقی کام کیا گیا۔ آخر میں جو رپورٹ پیش کی گئی، وہ یہ تھی کہ "ان نسخوں میں کتابت کی غلطی کے سوا کوئی فرق نہیں۔" (سیرت کا پیغام صفحہ ۱۶)

جس زبان میں قرآن نازل ہوا وہ آج بھی ایک زندہ زبان ہے۔ عراق سے لے کر مراکو تک تقریباً ۱۲ کروڑ انسانوں کی مادری زبان ہے۔ غیر عرب دنیا میں بھی لاکھوں آدمی اس زبان کو پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔

اس طرح اللہ تعالے کی طرف سے نوع انسانی کی ہدایت کے لیے جو کتاب نازل ہوئی تھی وہ اپنی اصلی زبان میں اپنے اصل الفاظ کے ساتھ بلا تغیر و تبدل موجود ہے۔

حضرت محمد صلعم

حضرت محمد صلعم اللہ کے آخری پیغمبر ہیں۔ اللہ کی طرف سے آپ نے ایک کتاب پیش کی جس کو قرآن کہتے ہیں۔ اس کتاب کی حفاظت کا جیسا عمدہ انتظام کیا گیا دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ بالکل اسی طرح آپ کی سیرت اور آپ کی زندگی کے حالات جس عمدگی سے محفوظ کیے گئے دنیا میں اپنی آپ مثال ہیں۔ آپ کی زندگی کے حالات نہ صرف صحت کے نقطۂ نظر سے اپنی کوئی مثال نہیں رکھتے بلکہ زندگی کے تفصیلی حالات کے نقطۂ نظر سے بھی دنیا میں کسی مذہبی یا غیر مذہبی رہنما کی زندگی کے حالات اس تفصیل اور صحت کے ساتھ محفوظ نہیں کیے گئے۔ آپ کی پرائیوٹ اور پبلک زندگی، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے پہلوؤں کو محفوظ کیا گیا جیسا کہ مولانا

مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

"بچپن سے لے کر آخری سانس تک جتنے لوگوں نے آپؐ کو دیکھا آپؐ کے حالات زندگی دیکھے، آپؐ کی تقریریں سنیں، آپؐ کو کسی چیز کا حکم دیتے ہوئے سنا، کسی چیز سے منع کرتے ہوئے سنا، انکی ایک عظیم تعداد نے سب کچھ یاد رکھا اور بعد کی نسلوں تک اسے پہنچایا۔ بعض محققین کے نزدیک ایسے لوگوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہونچتی ہے جنہوں نے آنکھوں دیکھے اور کانوں سنے ہوئے واقعات بعد کی نسل تک منتقل کیے تھے۔ رسول اللہ صلعم نے بعض احکام خود لکھوا کر بھی بعض لوگوں کو دیئے یا بھیجے، جو بعد کے لوگوں کو ملے۔ صحابہ میں سے کم ازکم چھ اصحاب ایسے تھے جنہوں نے آپ کی احادیث لکھ کر آپ کو سنادی تھیں تاکہ ان میں کوئی غلطی نہ رہ جائے"

(سیرت کا پیغام صفحہ ۱۸)

کسی واقعہ کے بارے میں ایک شخص جو وہاں موجود نہ تھا لکھتا ہے کہ فلاں واقعہ ایسے اور ایسے ہوا۔ چونکہ اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ اس کے علم کا ذریعہ کیا تھا، اس کی صحت کے بارے میں دل کو اطمینان نہیں ہوسکتا۔ اسی واقعہ کے بارے میں دوسرا شخص جو وہاں موجود نہ تھا لکھتا ہے کہ مجھ سے فلاں نے کہا اور فلاں سے فلاں نے جو جائے وقوع پر موجود تھا کہتا ہے کہ میں نے اس واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ ایسے اور ایسے ہوا۔ اگر یہ سارے اشخاص جن کے ذریعہ یہ خبر ہم تک پہونچی ہے قابل اعتماد ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ واقعہ کی صحت کے بارے میں شبہ کیا جائے۔ یہی سائنٹیفک طریقہ ہے۔ بالکل اسی سائنٹیفک

طریقہ سے رسول اللہ صلعم کے حالات ہم تک پہونچے ہیں۔ مثلاً "A" سے "B" نے کہا اور "B" سے "C" نے کہا کہ میں نے اپنے کانوں سے رسول اللہ صلعم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے۔ جن اشخاص کے ذریعہ یہ خبریں دوسروں تک منتقل ہوئیں ان کو "راوی" کہتے ہیں۔ بعد کے لوگوں نے سارے راویوں کے پورے حالات قلم بند کیے۔ تاکہ اگر کسی "راوی" کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ جھوٹا تھا۔ یا اس کا حافظہ کمزور تھا۔ یا بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کا عادی تھا۔ تو ایسے راویوں کی ساری حدیثیں کاٹ دی گئیں —— یہ تھا وہ اہتمام جو رسول اللہ صلعم کی سیرت کو محفوظ کرنے کے لیے کیا گیا۔ عقل بھی تسلیم کرتی ہے کہ سیرت کو محفوظ کرنے کا حق ادا ہو گیا۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو آج پوری دنیا میں حضرت محمد صلعم ہی وہ واحد ہستی ہیں جن کی زندگی کے پورے واقعات پورے صحت اور اعتماد کے ساتھ ہم تک پہونچے ہیں۔

نظامِ حیات (دین)

انسان دنیا میں بطور امتحان کے بھیجا گیا ہے۔ پوری زندگی کا کارنامہ ریکارڈ کیا جا رہا ہے۔ یہ زندگی کیونکر گزاری جائے کہ انسان خدا کے یہاں کامیاب قرار پائے —— یہ زندگی پیچیدہ ہے۔ اس کے انفرادی، اجتماعی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تمدنی وغیرہ بے حد شعبے ہیں جو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان مختلف شعبوں کو صحیح طور پر چلانے کے لیے جس علم کی ضرورت ہے۔ اس کا تعلق غیب سے ہے۔ اور غیب کا علم خدا کو ہے۔ یہ علم اگر انسان تک پہونچ سکتا ہے تو خدا کی کتاب اور خدا کے پیغمبروں کے

ذریعہ — آج تک جتنے پیغمبر دنیا میں تشریف لائے ان میں سے سوائے حضرت محمد صلعم کے کسی کی سیرت صحت کے ساتھ محفوظ نہیں ہے۔ اللہ کی طرف سے جتنی کتابیں آئیں ان میں "قرآن" پوری صحت کے ساتھ دنیا میں موجود ہے۔ اس لیے جس نظامِ حیات (دین) کے مطابق زندگی گزارنے کے بعد ہی انسان خدا کے یہاں کامیاب قرار پا سکتا ہے وہ "دینِ اسلام" ہے۔ چنانچہ قرآن کا دعویٰ ہے:-

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامَ

جس کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں:-

"قرآن کا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ اللہ کے نزدیک اسلام ایک طریقِ زندگی ہے بلکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام ہی ایک حقیقی اور صحیح طریقِ زندگی یا طرزِ فکر و عمل ہے" (دین حق صفحہ ۶)

اسلام کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں:-

"خدا نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے انسان کے لیے جس طریق فکر و عمل کی طرف رہنمائی کی ہے، اس کو قبول کرے اور اپنی آزادی فکر — بالفاظ صحیح تر آوارگی فکر و عمل — کو چھوڑ کر اس کی پیروی و اطاعت اختیار کرے — اسی چیز کو قرآن "الاسلام" کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے"

(دین حق صفحہ ۹ ۸)

ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ زندگی رکی ہوئی تو نہیں ہے۔ وہ تو رواں دواں ہے دنیا کے حالات بھی روز بروز بدل رہے ہیں دنیا کے مختلف حصوں میں انسانی زندگی میں یکسانیت بھی نہیں پائی جاتی — پھر ایک ہی نظامِ حیات (دین)

مختلف جغرافیائی خطوں اور تاریخ کے مختلف ادوار میں کیونکر کامیاب ہو سکتا ہے؟ ــــ بے شک دنیا کے مختلف حصوں میں انسانی زندگی مختلف ضرور ہے اسی طرح تاریخی ادوار میں انسان ترقی کے مختلف منازل سے گزرا ہے لیکن یہ اختلاف اتنے اہم نہیں کہ ان کی وجہ سے ہر خطۂ زمین کا نظام حیات (دین) الگ ہو اور ہر تاریخی دور کے لیے الگ الگ دین ہونا چاہیے۔ اگر ان اختلافات کی کوئی اہمیت ہے تو اس سے کہیں زیادہ اختلاف عورت اور مرد میں پائے جاتے ہیں۔ ایک انسان اور دوسرے انسان میں پائے جاتے ہیں۔ ابھی حال میں سرجری کا ایک تجربہ سامنے آیا ہے:۔

"اگر ایک شخص کو چوٹ آگئی ہو اور کسی عضو کے ایک حصہ کا چمڑہ کٹ کر نکل گیا ہو اور اسی شخص کے دوسرے عضو کا چمڑہ کاٹ کر وہاں لگا یا جائے تو جڑ جاتا ہے۔ آج کل سرجری ڈیپارٹمنٹ میں اس طرح کی پیوند کاری عام ہو گئی ہے۔ لیکن اس پیوند کاری میں ایک شخص کا چمڑہ دوسرے شخص میں لگا دیا جائے تو نہیں جڑتا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ نہ صرف شکل و صورت، مزاج اور طرز گفتگو وغیرہ میں ایک شخص دوسرے سے مختلف ہے بلکہ ایک شخص کا جسم بھی دوسرے شخص کے جسم سے میل نہیں کھاتا ــــ ان اختلافات کے باوجود ہر شخص کے لیے الگ الگ نظام زندگی بنانے کا کوئی بھی حامی نہیں۔ بلکہ انفرادی، جنسی اور خاندانی کثرتوں کے اندر وحدت کا ایک عنصر اور نہایت ہی پائیدار عنصر ایسا پایا جاتا ہے جس کی بنیاد پر بڑے بڑے ملکوں میں ایک ہی نظام زندگی کے اندر مختلف قوموں، نسلوں کے لوگ زندگی گزارتے ہیں تو قومی

اور وطنی کثرتوں کے درمیان انسانی وحدت کے تصور پر ایک نظام زندگی کیوں نہیں بنایا جا سکتا۔ اس لیے انسان ہونے کی حیثیت سے جس صحیح دین کی ضرورت ہے وہ بہر حال ایک ہی ہونا چاہیے۔

انگریزی کا مقولہ ہے:-

(Too Much emphasis on the freedom of the Individual will create chaos and too much emphasis on the controlof the Government will create Dictatorship)

(افراد کو حد سے زیادہ آزادی ملی تو افراتفری پھیل جائے گی اور حکومت کے اختیارات حد سے بڑھے تو تاناشاہی آجائے گی)

اب یہ محض ایک مقولہ نہ رہا۔ بلکہ اسی ہندوستان میں چند دنوں قبل دونوں صورتوں کے تلخ تجربات سامنے آچکے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ افراد کو آزادی ملنا چاہیے تاکہ ان کا نشو و نما رکنے نہ پائے۔ لیکن ایک حد پر پہونچ کر یہ آزادی ختم ہو جانی چاہیے تاکہ حکومت کی کارکردگی متاثر نہ ہونے پائے ــــ حکومت کو اختیارات ملنے چاہئیں لیکن اتنے زیادہ نہ ہوں کہ افراد کی آزادی متاثر ہو جائے ــــ لیکن دنیا کا تجربہ بتاتا ہے کہ خواہ افراد ہوں یا حکومتیں آزادی ملنے کے بعد اپنے حدود کے اندر مشکل ہی سے رہ پاتی ہیں جب کبھی افراد کو موقع ملا تو اس حد تک پہونچے کہ حکومت ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئی۔ اور جب کبھی حکومتوں کو موقع ملا تو پورا ملک جیل خانہ میں تبدیل ہو گیا۔ دونوں فریقوں کے درمیان اختیارات کی ایک منصفانہ حد بندی نہ افراد کے بس کی بات ہے اور نہ حکومتوں کے ــــ ایک مکمل

نظام تیار کرنا تو دور کی بات ہے، افراد اور حکومتوں کے اختیارات کے درمیان حد بندی کی صلاحیت انسان کے اندر نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ آج پوری دنیا میں یہ منصفانہ حد بندی کہیں نہیں ملتی۔ نہ بادشاہت میں نہ ڈکٹیٹرشپ میں اور نہ جمہوریت میں۔

انسان ایک متمدن ہستی ہے۔ اس کے آپس میں مل جل کر رہنے ہی میں انسانیت کی فلاح ہے اور مل جل کر رہنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہر شخص کو پوری آزادی ملے۔ لیکن اس کی آزادی سے دوسروں کو نقصان نہ پہونچنے پائے۔ جیسا کہ انگریزی کا مقولہ ہے:-

"Your freedom ends where my nose begins"

(ایک شخص کو آزادی اسی حد تک ملنی چاہیے جس سے دوسرے شخص کی آزادی متاثر نہ ہونے پائے)

یقیناً ایک ایسے نظامِ زندگی کی ضرورت ہے جس میں ہر شخص کو حقوق ملتے رہیں۔ لیکن حقوق کا دامن واجبات سے بندھا ہوا ہے۔ انسان کی یہ کمزوری ہر شخص جانتا ہے کہ حقوق سب کو پسند ہیں مگر واجبات کی ادائیگی شاق گزرتی ہے۔

واجبات کی ایماندارانہ ادائیگی اسی وقت ممکن ہے جب ہمیں اپنے نفس پر قابو ہو۔ چنانچہ (B. Russall) نے اپنی کتاب (Authority and Individual) میں اسی کمزوری کی طرف اشارہ کیا ہے:-

"ہماری موجودہ مشکل یہ ہے کہ ہم نے خارجی قوتوں کو بے حساب مسخر کر لیا ہے لیکن ان قوتوں کو قطعاً مسخر نہیں کیا جو ہمارے اندر ہیں۔"

Barend نے بھی اپنی کتاب (Foundation of Human

conflict) میں یہی چیز کہی ہے:-

"انسان نے اپنے طبعی ماحول پر اچھا خاصا قابو پا لیا ہے لیکن اپنے جذباتی ماحول پر قابو پانا نہیں سیکھا"

A.W. Maslet نے اپنی کتاب (Unsolved Problems) میں لکھا ہے:-

"سائنسدان کسی بحث اور مسئلہ میں اس سے زیادہ عاجز اور درماندہ نہیں جتنا خود انسان کے معاملہ میں ہے۔ وہ ایٹم کو توڑ سکتا ہے۔ بعید ستاروں کی روشنی کی تحلیل و تجزیہ کر سکتا ہے۔ وہ بجلی کو غلام بنا سکتا ہے۔ لیکن یہی سائنسداں جب زندگی کی حقیقت اور اس سے بڑھ کر اپنی یا انسانی حقیقت سمجھنا چاہتا ہے تو مشکلات ہی مشکلات سے دوچار ہو جاتا ہے"

Dr. Alexs Carrel نے اپنی کتاب (Man the unknown) میں بھی یہی بات کہی ہے۔

"گو ہمارے دنیا بھر کے علمائے سائنس و فلسفہ اور اسراقیہ (Mystics) کے فراہم کردہ معلومات و مشاہدات کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے تاہم خود اپنی (انسانی) ذات و حقیقت کے چند پہلو ہی کچھ گرفت میں آسکے ہیں۔ پوری طرح انسان کو ہم نے نہیں جانا"

سید قطب شہیدؒ اپنی کتاب "اسلام اور مغربی تہذیبی مسائل" کے صفحہ ۲۷ پر لکھتے ہیں:-

"قرآن کی کثیر آیات اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ انسان اپنے

نفس اپنے مستقبل اور اپنے افعال کے انجام سے سراسر ناواقف ہے یہی نہیں بلکہ انسان شہوتوں، خواہشوں، اور ضعف سے اس قدر مغلوب ہے کہ اس میں کسی طرح یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اپنا ضابطۂ حیات خود متعین کرلے۔"

آگے چل کر اسی کتاب کے صفحہ ۲۹ پر لکھتے ہیں :۔

"وہ اپنے آپ سے، اپنے تصرفات اور خواہشوں کے انجام سے ناواقف ہیں اور اپنی خواہشوں اور شہوتوں کے سامنے جھک جاتے ہیں اور یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ اگر انسان اپنا قانون زندگی خود بنائیں اور اپنی زندگی کا منہاج آپ متعین کریں تو ان کا وجود اور ان کا سفر حیات خطرے میں پڑجائے۔"

ان حالات میں، اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ انسان ہدایت و رہنمائی کے لیے قرآن اور حضرت محمد صلعم کی تعلیمات کی طرف رجوع کرے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ الموافقات میں فرماتے ہیں :۔

قرآن مجید کے اصل علوم تین ہیں :۔

۱۔ ذاتِ حق کی معرفت

۲۔ حق تعالٰے کی رضا کی صورتیں

۳۔ انسان کا انجام

ذاتِ حق کی معرفت

دنیا کی اکثریت خدا کی قائل ہے منکرین خدا کا موقف اب بہت کمزور ہوچکا ہے۔ لینڈالٹ کا نظریہ تھا کہ مادّہ مرتا نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جو چیز مرتی نہیں وہ پیدا بھی نہیں ہوتی۔ اس لیے پیدا کرنے والے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ ڈاروِن نے کہا تھا

کہ بے جان مادہ میں جان خود بخود پیدا ہوگئی پھر زندگی کی کش مکش کے دوران مختلف قسم کے پودے اور جانور وجود میں آگئے۔ یہ سب ارتقاء (Evolu-tion) کا کرشمہ تھا۔ نیوٹن نے کہا تھا کہ کائنات میں سورج، چاند اور تارے گھڑی کے پرزوں کی طرح حرکت کر رہے ہیں یہ سب کشش کا چمتکار ہے۔ لیکن آج یہ سارے چمتکار غلط ثابت ہو چکے۔ کیونٹم (Quantum) کے نظریہ نے ثابت کر دیا کہ مادہ فنا ہوتا ہے۔ پینسپرمیا (Panspermia) کے نظریہ نے تسلیم کر لیا کہ زمین پر زندگی بے جان مادہ سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ کسی سیارہ پر سے یہاں پھینکی گئی ـــــ مذہب نے بھی تو یہی کہا تھا کہ اس زمین پر پہلا انسانی جوڑہ آدم اور حوا یا ایڈم اور ایو یا منو اور سنتو پا کی شکل میں اس زمین پر اُتارا گیا۔ سائنسی دنیا میں استنباط کو اہم ذریعہ معلومات تسلیم کرنے کے بعد کائنات کی ہر چیز خدا کے وجود کی طرف اشارہ کر رہی ہے اس طرح سائنسی دنیا میں خدا کے اقرار کی طرف زبردست جھکاؤ پیدا ہو گیا ہے لیکن خدا کے اقرار کے باوجود ذہنوں میں خدا کا ایسا تصور پایا جاتا ہے جس سے عملی زندگی سے خدا بے تعلق ہو کر رہ گیا ہے۔ خدا کے ماننے والوں اور خدا کے منکرین کی عملی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے۔

قرآن توحید کا علمبردار ہے۔ اور اس کا کہنا ہے کہ پوری کائنات کا خالق، مالک، حاکم اور رب صرف اللہ تعالےٰ ہے۔ پوری دنیا حاکمیت انسان (Sovereignty of man) کی قائل ہے اور صرف قرآن ہی حاکمیتِ اللہ (sovereignty of God) کا علمبردار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پوری کائنات کا اللہ ہی اکیلا بادشاہ ہے۔ چنانچہ قرآن میں سورۂ حشر کی آیت ۲۳ میں الملک (بادشاہ) کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودی صاحب

رماتے ہیں :-

"اصل میں لفظ الملک استعمال ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اصل بادشاہ وہی ہے نیز مطلقاً الملک کا لفظ استعمال کرنے سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ وہ کسی خاص علاقے یا مخصوص مملکت کا نہیں بلکہ سارے جہان کا بادشاہ ہے۔ پوری کائنات پر اس کی سلطانی و فرمانروائی محیط ہے۔ ہر چیز کا وہ مالک ہے ہر شے اس کے تصرف اور اقتدار اور حکم کے تابع ہے۔ اور اس کی حاکمیت (Soverignty) کو محدود کرنے والی کوئی شے نہیں ہے .... اللہ تعالےٰ کی بادشاہی۔ حاکمیت کے کسی محدود اور مجازی مفہوم میں نہیں بلکہ اسکے پورے مفہوم میں۔ اس کے مکمل تصور کے لحاظ سے حقیقی بادشاہی ہے۔ بلکہ درحقیقت حاکمیت جس چیز کا نام ہے وہ اگر کہیں پائی جاتی ہے تو صرف اللہ تعالےٰ کی بادشاہی میں پائی جاتی ہے اس کے سوا جہاں بھی اس کے ہونے کا دعوٰی کیا جاتا ہے خواہ وہ کسی بادشاہ یا ڈکٹیٹر کی ذات ہو یا کوئی طبقہ یا گروہ یا خاندان یا کوئی قوم ہو، اسے فی الواقع کوئی حاکمیت حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ حاکمیت سرے سے اس حکومت کو کہتے ہی نہیں ہیں جو کسی کا عطیہ ہو۔ جو کبھی ملتی ہو اور کبھی سلب ہو جاتی ہو جسے دوسری طاقت سے خطرہ لاحق ہو سکتا ہو۔ جس کا قیام وبقا عارضی اور وقتی ہو۔ اور جس کے دائرۂ اقتدار کو بہت سی دوسری متصادم قوتیں محدود کرتی ہوں۔

لیکن قرآن صرف یہ کہنے پر اکتفا نہیں کرتا کہ اللہ تعالےٰ کائنات کا بادشاہ ہے بلکہ بعد کے فقروں میں یہ تصریح کرتا ہے کہ وہ ایسا بادشاہ ہے جو قدوس ہے، سلام ہے، مومن ہے، مہیمن ہے، عزیز ہے، جبّار ہے، متکبر ہے، خالق ہے، مصوّر ہے۔" (تفہیم القرآن جلد ۵ صفحہ ۱۳-۱۲۴)

قدوس کی تشریح کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:-

قدوس کے معنی ہیں تمام بری صفات سے پاک اور منزہ ہونا۔ اور قدوس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سے بدرجہا بالا و برتر ہے کہ اس کی ذات میں کوئی عیب یا نقص یا کوئی قبیح صفت پائی جائے۔ بلکہ وہ ایک پاکیزہ ہستی ہے جس کے بارے میں کسی برائی کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ قدوسیت در حقیقت حاکمیت کے اولین لوازم میں سے ہے۔ انسان کی عقل اور فطرت یہ ماننے سے انکار کرتی ہے کہ حاکمیت کی حامل کوئی ایسی ہستی ہو جو شریر، بدخلق ہو اور بدنیت ہو۔ جس میں قبیح صفات پائی جاتی ہوں۔ جس کے اقتدار سے اس کے محکوموں کو بھلائی نصیب ہونے کے بجائے برائی کا خطرہ ہو۔ اسی بنا پر انسان جہاں بھی حاکمیت کو مرکوز قرار دیتا ہے وہاں قدوسیت نہیں بھی ہوتی تو اسے موجود فرض کر لیتا ہے۔ کیونکہ قدوسیت کے بغیر اقتدارِ مطلق ناقابل تصور ہے لیکن بہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالےٰ کے سوا در حقیقت کوئی مقتدرِ اعلیٰ بھی قدوس

نہیں ہے اور نہیں ہو سکتا۔ شخصی بادشاہی ہو یا جمہوری حاکمیّت
یا اشتراکی نظام کی فرمانروائی یا انسانی حکومت کی کوئی دوسری
صورت بہرحال اس کے حق میں قدوسیت کا تصوّر تک نہیں
کیا جا سکتا۔"
(تفہیم القرآن جلد ۵ صفحہ ۱۴-۲۱۳)

چالاک لوگوں نے سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت حاکمیّت کے تصور میں غلط فہمیاں پیدا کیں تاکہ بلا مار دھاڑ کے حاکمیّت کے مقام پر پہونچ جائیں بت پرستی کے زمانہ میں جب دیوی اور دیوتا خدا مانے جاتے تھے، حاکمیّت کے مقام پر پہونچنے کے لیے اسی کو ذریعہ بنایا گیا۔ چنانچہ فرمارواؤں نے اپنا نسب انہیں دیوتاؤں سے جوڑا۔ خود ہندوستان میں "چندر بنسی" اور "سورج بنسی" راجاؤں نے بہت دنوں حکومت کی ہے۔ یہ چیز ایک حقیقت بن چکی تھی کہ "راجہ" ایشور کا اوتار ہوتا ہے۔ کھلم کھلا ان کو "ان داتا" (رزاق) کہا گیا۔

آج قرآن کا تصوّر ذہنوں سے اس قدر نکل چکا ہے کہ انسان کی حاکمیّت (Sovereignty of man) ایک مسلّمہ حقیقت بن چکی ہے۔ چنانچہ مصر کے مشہور مفکّر سیّد قطب شہیدؒ نے جاہلیت کے اسی دعوے کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

"اس طنطنے اور دعوے کے ساتھ کہ انسانوں کو یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ خود افکار و اقدار کی تخلیق کریں، شرائع و قوانین وضع کریں، اور اس سلسلہ میں انہیں یہ معلوم کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسانی زندگی کے لیے کیا نظام اور لائحہ عمل تجویز کیا ہے۔ کیا ہدایت نازل کی ہے۔

اور کس صورت میں نازل کی ہے؟ اس باغیانہ انسانی اقدار
اور بے لگام تصورِ حاکمیت کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ خلق اللہ
ظلم اور جارحیت کی چکی میں پس رہی ہے"۔

(جادہ و منزل صفحہ ۷۴)

خدا کے بارے میں قرآن کا دعویٰ ہے کہ "لا الٰہ الا اللہ" یعنی اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے چنانچہ سید قطب شہیدؒ اسی کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"عرب اپنی زبان دانی کی بدولت "الٰہ" کا مفہوم اور "لا الٰہ الا اللہ" کا مدعا خوب سمجھتے تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ "الوہیت" سے مراد حاکمیت اعلیٰ ہے اور وہ اس امر سے کما حقہ آگاہ تھے کہ الوہیت کو صرف اللہ تعالٰے کے لیے مخصوص گردانے کے صاف معنی ہیں کہ اقتدار پورے کا پورا، کاہنوں، پروہتوں قبائل کے سرداروں اور امراء و حکام کے ہاتھ سے چھین کر اللہ کی طرف لوٹا دیا جائے۔ ... وہ خوب جانتے تھے "لا الٰہ الا اللہ" کا اعلان درحقیقت اقتدار کے خلاف ایک چیلنج ہے جس نے الوہیت کی سب سے بڑی صفتِ حاکمیت کو غصب کر رکھا ہے" (جادہ و منزل صفحہ ۹۹)

آگے چل کر موصوف فرماتے ہیں:-

"یہ ملک اللہ تعالٰے کا ہے اور اس پر صرف اللہ ہی کا اقتدار قائم ہونا چاہیے۔ اور اللہ کا اقتدار صرف اس صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ اس کی فضاؤں میں صرف "لا الٰہ الا اللہ" کا پرچم لہرائے۔ ... انسان صرف خدائے واحد

کے بندے اور غلام ہیں اور وہ صرف اس صورت میں بندے
اور غلام رہ سکتے ہیں کہ ان کی زندگیوں میں صرف اللہ کی الوہیت
کا بول بالا ہو۔ اور ایک عرب "لا الٰہ الا اللہ" کا لغوی لحاظ
سے جو مفہوم سمجھتا تھا وہ یہ تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی حاکمیت
نہ ہو۔ اللہ کے سوا کوئی ہستی قانون اور شریعت کا منبع و
ماخذ نہ ہو اور انسان کا انسان پر غلبہ و اقتدار باقی نہ رہے
کیونکہ اقتدار بہمہ وجوہ اللہ ہی کے لیے ہے"

(جادہ و منزل صفحہ ۱۰۳)

اسی کتاب میں ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

"جو لوگ اللہ کی حاکمیت سے بغاوت کر کے اپنی ذات
کے لیے حاکمیت کا دعویٰ کریں ان کے اس دعوے کی
تردید کریں" (جادہ و منزل صفحہ ۱۲۵)

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

"اسلام جس حقیقت کا نام ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کی شریعت
کو ہر حال میں بلا چون و چرا قبول کیا جائے اور دوسری
تمام شریعتوں کو اور ان کی ہر شکل کو قبول کرنے سے انکار
کر دیا جائے"۔ (صفحہ ۱۲۷)

خدا کی ذات اور صفات کا صحیح تصور قرآنی تعلیم کا اہم نکتہ ہے۔ قرآنی تعلیم
کے مخالفین کو مسلمانوں میں بگاڑ پیدا کرنے کی راہ مل ہی نہیں سکتی اگر خدا
کی ذات اور صفات کے بارے میں لوگوں کے ذہن میں غلط فہمیاں نہ پیدا
کی جائیں۔ انسان مجموعی حیثیت سے خدا کا منکر نہیں رہا ہے لیکن انسانی بگاڑ

کی ابتداء یہیں سے ہوتی ہے۔ جب انسان خدا کی معرفت میں غلطی کرتا ہے یا خدا کے ساتھ دوسروں کو الوہیت میں شریک ٹھہراتا ہے ۔ کبھی عقیدہ اور عبادت میں اور کبھی اللہ کی حاکمیت کی اتباع میں چنانچہ ان دونوں صورتوں کے بارے میں سیّد قطب شہیدؒ فرماتے ہیں:۔

"یہ دونوں شکلیں اس اعتبار سے خالصتہً شرک ہیں کہ وہ انسان کو اللہ کے دین سے دور لے جانے والی تھیں"۔

چنانچہ ہر زمانہ میں انبیاء اور مصلحین کا یہی مشن تھا کہ ان دونوں قسم کے شرک سے انسانیت کو محفوظ رکھا جائے۔ لیکن جیسے ہی انسان کے ذہن میں خدا کا تصوّر دھندلا ہوا وہ دوبارہ شرک کی راہ پر چل پڑا۔ جیسا کہ سیّد قطب فرماتے ہیں:۔

"وہ دوبارہ شرک کی راہ پر چل پڑا۔ کبھی عقیدہ و عبادت غیر اللہ کی حد تک اور کبھی دوسروں کی حاکمیت تسلیم کرنے اور ان کی پیروی کرنے کی حد تک۔ اور کبھی بیک وقت دونوں صورتوں میں مبتلا ہو کر"۔ (جادہ و منزل صفحہ ۱۲۶)

اللہ کی رضا

خداوند عالم نے جو ساری کائنات کا خالق مالک اور فرمارواہے اپنی بے پایاں مملکت کے اس حصہ میں جس کو دنیا کہتے ہیں انسان کو پیدا کیا اسے جاننے، سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں دیں بھلائی اور برائی کی تمیز دی، انتخاب اور ارادہ کی آزادی عطا کی، تصرف کے اختیارات بخشے اور

فی الجملہ ایک طرح کی خود اختیاری (Autonomy) دے کر اس زمین پر اپنا خلیفہ بنایا تاکہ اس کا امتحان لیا جائے۔ اس کا امتحان یہ تھا کہ کیا وہ انفس و آفاق کی چیزوں پر غور کر کے خدا کے وجود کو تسلیم کرتا ہے یا نہیں۔ جس طرح اس کائنات کی ساری چیزیں اللہ کی مطیع ہیں وہ خود کو بھی اللہ کی اطاعت میں دینے کو تیار ہے یا نہیں۔ اس امتحان میں اس کو صرف وجدان کے سہارے نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ نبیوں اور پیغمبروں کے ذریعہ ہر دور میں اس کی رہنمائی کی گئی۔ ان حقیقتوں سے اسے باخبر کیا گیا جن کو وہ صرف وجدان کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتا تھا ـــــ اب اللہ کی رضا یہی ہے کہ وہ ایمانداری کے ساتھ ان حقیقتوں کو تسلیم کرے اور پیغمبروں نے اس کی زندگی کا جو مقصد قرار دیا ہے اسی کو اپنی منزل قرار دے اور اپنی پوری زندگی انہیں اصولوں پر چلائے تاکہ اللہ اس سے راضی ہو جائے اور جب وہ اس امتحان کی دنیا سے واپس جائے تو اللہ اسے انعام کے طور پر اس عیش و آرام کے مقام پر رکھے جس کو جنت کہتے ہیں۔

سورج، چاند، تارے سب اپنی اپنی ڈیوٹی پر رواں دواں ہیں۔ جو ضابطہ زندگی انہیں مالک کی طرف سے ملا ہوا ہے اس سے بال برابر ہٹ جانا ان کے بس میں نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح انسان بھی اس دنیا میں اپنے غیر ارادی شعبہ میں الٰہی قانون میں بندھا ہوا ہے۔ آنکھ کے ذمہ دیکھنا ہے وہ اس سے سننے کا کام نہیں کر سکتی۔ اسی طرح کان کا کام سننا اور پیٹ کا کام کھانا ہضم کرنا ہے۔ جس میں وہ خدا کے بنائے ہوئے قانون کی پابندی پر مجبور ہیں۔ لیکن اس کی زندگی کے کچھ حصے ایسے ہیں جس میں خدا نے اسے آزادی دے رکھی ہے کیونکہ آزادی کے بغیر امتحان بے معنی ہے اس کا

امتحان اسی آزادی کے شعبہ میں ہو رہا ہے۔ اس کا جی چاہے تو خدا کو کائنات اور خود اپنا خدا تسلیم کرے اور جی چاہے تو کہہ دے کہ یہ سب کچھ خود بخود وجود میں آ گیا ہے۔ جی چاہے تو آخرت کو تسلیم کرے اور خدا کے سامنے اپنے سارے کاموں کی جوابدہی کے احساس کے ساتھ زندگی گزارے اور جی چاہے تو کہہ دے کہ مرنے کے بعد انسان فنا ہو جاتا ہے اس کو کسی کے سامنے جوابدہی کرنی نہیں ہے۔ چنانچہ خدا کی رضا حاصل کرنے کا میدان یہی ارادی حصہ ہے۔ اس شعبہ میں انسان کی رہنمائی کا بھی پورا پورا انتظام کیا گیا ہے تاکہ جو لوگ خدا کی رضا حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کو سہولت مل سکے۔

انسان کی پوری زندگی امتحان کی زندگی ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک اور گھر کی زندگی سے لے کر بین الاقوامی زندگی تک جتنے معاملات درپیش ہیں، جن مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے یہ سب اس کے امتحان کا کورس (Syllabus) ہے —— امتحان کی زندگی کوئی خوشگوار زندگی نہیں ہوتی۔ نفس کی خواہشات کے بالمقابل خدا کے ہدایت پر چلنا آسان کام نہیں ہے۔ پھر بھی زندگی کے کسی خاص شعبہ میں یہ رویہ اختیار کرنے کا ہوتا تو کام چل بھی سکتا تھا۔ پوری ۲۴ گھنٹہ کی زندگی کو پابند بنا دینا اور نفس کو ایک منٹ کے لیے بھی چھوٹ نہ دینا بڑا ہی مشکل کام ہے۔ یہ چھوٹ کی زندگی نفس کو بے حد مرغوب ہے۔ نفس کو غلام بن کر رہنا بالکل پسند نہیں ہے وہ تو خدا بن کر رہنا چاہتا ہے۔ یہ خدائی کا میدان جتنا ہی وسیع ہوتا جاتا ہے اس کا لطف اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے۔ گھر کی زندگی کے مقابلہ میں پورے محلہ پہ خدائی کے اختیارات زیادہ مرغوب ہیں۔ اسی طرح محلہ کی خدائی کے مقابلہ میں بڑے ملک کی خدائی، اور پوری دنیا کی خدائی میں زیادہ کشش ہے۔

جب تک انسان کے ذہن پر جوابدہی کا احساس زندہ رہا اور آخرت کی کامیابی اور اللہ کی رضا ہی اس کی منزل رہی نفس کی خواہشات کے بالمقابل خدا کی بندگی اور غلامی میں اس کو زیادہ لطف آتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے جوابدہی کا تصور ماند پڑتا گیا نفس کو سر اٹھانے کا موقع ملا۔ نفس اور ضمیر کی کشمکش میں نفس کا پلہ بھاری ہو گیا۔ "دین اور دنیا کی تفریق" کے نظریہ نے شکست خوردہ ضمیر کی کمر توڑ دی اکھنڈ زندگی کے مقابلہ میں منقسم زندگی پر راضی ہونا پڑا۔ کمزوری سارے امراض کی ماں ہے خدا کی بندگی کا دائرہ دن بدن سکڑتا گیا۔ اور نفس کی خدائی کا میدان وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ اس منقسم زندگی میں رہتے ایک زمانہ گزر گیا۔ اور اسی حال میں نسلوں پر نسلیں اٹھتی رہیں یہاں تک کہ یہی منقسم زندگی کا تصور دل و دماغ پر چھا گیا۔ مصلحین اٹھے۔ لیکن یہ "منقسم زندگی" کا تصور لیے ہوئے اٹھے۔ اس لیے ان کی نگاہ اصل مرض تک نہ پہونچ سکی۔ اور انکی جدوجہد اسی منقسم زندگی — کے گرد گھوم پھر کر رہ گئی۔ اگر کسی بندۂ خدا نے "اکھنڈ زندگی" کی طرف متوجہ کیا تو اس کو الٹا طعنہ دیا گیا کہ "مذہب کو سیاست کا اکھاڑہ بنا دیا" کہنے والے کا مطلب کچھ بھی ہو لیکن اس سے "دین و دنیا کی تفریق" کے نظریہ کی ہی تائید ہوتی ہے۔ حالانکہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے دوسرے ادیان کی پیوند کاری اس دین کی فطرت کے خلاف ہے جیسا کہ سید قطب شہیدؒ فرماتے ہیں:۔

"انسان کی زندگی اور امورِ دنیا سے علیحدگی اس دین کی فطرت نہیں بلکہ کسی دین کی فطرت نہیں"

(اسلام کا روشن مستقبل صفحہ ۱۱)

ایک دوسرے مقام پر سید صاحب فرماتے ہیں:۔

"دنیا سے الگ تھلگ رہنا "الدین" کے مزاج کے خلاف ہے"
(اسلام کا روشن مستقبل صفحہ ۲۸)

ایک اور جگہ سید صاحب فرماتے ہیں :-
"مثالی اسلامی معاشرے کے تمام قوانین کا ماخذ خدا کی ذات ہوتی ہے اور ان الٰہی قوانین میں وہ کسی اور قانون کی آمیزش کو گوارہ نہیں کرتا"
(جادہ و منزل صفحہ ۲۳۰)

آخرت (پرلوک)

قرآن کا کہنا ہے کہ یہ دنیا ایک دن ختم ہو جائے گی اور ایک دوسری دنیا قائم ہوگی۔ اب تک جتنے انسان پیدا ہوئے یا آئندہ پیدا ہوں گے سب دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔ انہوں نے اس دنیا میں جو کچھ کیا ہوگا اس کا حساب کتاب ہوگا اور اسی کے مطابق سزا یا انعام ملے گا —— اسی کو قرآن آخرت کہتا ہے۔ عقیدۂ آخرت قرآنی تعلیم کا ایک اہم جزو ہے۔

قرآن دراصل کسی نئے نظریہ کو قائم کرنے نہیں آیا ہے۔ وہ صرف اس لیے نازل ہوا ہے کہ وہ ان ابدی حقیقتوں کو واضح کرے جن کو ہر دور اور ہر ملک میں اللہ کے نبی اور پیغمبر (ایلچی دوت) انسانوں تک پہونچاتے رہے ہیں۔ لیکن ہوتا یہی رہا کہ جو چیزیں انسان کے نفس کے خلاف ہوئیں ان کو اس نے الٰہی ہدایات سے نکال باہر کیا۔ اور دوسری دل پسند چیزیں اس میں بھر دیں یہاں تک کہ بعض مذاہب میں وہ باتیں بھی شامل کر لی گئیں جو خود اس مذہب کی ضد تھیں۔ اس طرح خود انسانوں نے اپنی نااہلی سے

خدائی ہدایات کو اصل حالت میں نہ رہنے دیا، صحیح اور غلط کو آپس میں خلط ملط کر دیا۔ قرآن انہیں غلط اور صحیح باتوں کو چھانٹ چھانٹ کر الگ کرنے آیا ہے قرآن خود کو "فرقان" کہتا ہے یعنی کسوٹی جو کھرے اور کھوٹے کو الگ کرتی ہے چنانچہ قرآن نے ایک ایک حقیقت پر انگلی رکھ کر بتلایا کہ یہ صحیح ہے اور یہ غلط۔ اس میں اتنا صحیح ہے اور اتنا غلط۔ اور یہ بالکل ہی غلط ہے۔ فطرتاً یہ سوال ذہن میں ابھر سکتا ہے کہ جب قرآن کسی نئی بات کو پیش کرنے نہیں آیا ہے تو کیا آخرت کا تصور قدیم مذہبی کتابوں میں موجود ہے؟ چنانچہ قدیم مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان مذہبی کتابوں میں آخرت کا تصور موجود ہے۔ قرآن کے نظریۂ آخرت کی تائید ویدوں میں ہے اور دوزخ اور جنت کا تفصیلی ذکر بھی موجود ہے۔ وید زندگی کو تین قسموں میں بانٹتا ہے۔ ۱۔ دنیا کی زندگی۔ ۲۔ آخرت کی زندگی ۳۔ ان دونوں کے درمیان کی زندگی جس کو وید پتالوک (पिता लोक) کہتا ہے۔ یہ بندگی کی زندگی ہے۔ جیسا کہ براہداڈیک اپنشد میں لکھا ہے:۔

"انسان کے لیے واقعی دو لوک ہیں ایک دنیا اور دوسری آخرت، تیسری بیچ والی کا نام "سندھیا" ہے وہ نیند کا مقام ہے۔ اس مقام میں ٹھہرا ہوا انسان دنیا اور آخرت دونوں کو دیکھتا ہے۔"

اواگون کا نظریہ جو پرلوک (آخرت) کی ضد ہے وید کا نظریہ نہیں ہے۔ وید میں تو آواگون کا ذکر بھی نہیں ہے۔ شری ستیہ پرکاش فرماتے ہیں:۔

"ویدوں میں آواگون کا نظریہ نہیں ہے۔ اس بات پر تو میں جوا بھی کھیل سکتا ہوں" (آواگون پرسٹھ ۱۰۴)

ڈاکٹر رادھا کرشنن جو ہندو مذہب پر اتھارٹی مانے جاتے ہیں ان کا بھی یہی خیال ہے کہ ویدوں میں آواگون کا نظریہ نہیں ہے۔ اور یہی خیال بہت سے ہندو پنڈتوں کا بھی ہے۔

ڈاکٹر میکسمولر (Dr. Max Mullar) جنہوں نے ویدوں پر بہت کام کیا ہے۔ وید کا پہلا انگریزی ترجمہ انہوں نے کیا ہے جس سے مغربی ممالک میں وید کا تعارف ہوا۔ لکھتے ہیں کہ :۔

"ویدوں میں آواگون کا نظریہ نہیں پایا جاتا۔ بلکہ ایک "انتم جن" کا نظریہ ملتا ہے۔"

ڈاکٹر پیراڈا چوہان (Dr. Parada Chaoman) لکھتے ہیں :۔

"ویدوں میں پنر جنم ملتا تو ضرور ہے لیکن اس میں اس جنم کے بعد صرف ایک جنم کا ذکر ہے۔ ہزاروں جنموں کا نہیں۔"

(پنر جنم اور وید پرسٹھ ۹۳)

رگ وید میں ہے :۔

"ہے اندرا مجھے اس جگہ پہونچا جہاں مرت (موت) نہیں۔ امر لوک میں جہاں روشنی ہے۔ اور نہ ختم ہونے والی روشنی برستی رہتی ہے" (۷-۱۱۳-۹)

اتھر وید میں ہے :۔

"جنت میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ نہ موت کا اور نہ بڑھاپے کا۔"

(۴-۴-۱۸)

مہابھارت کے گیتا حصہ میں کرشن جی ارجن کو سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں :۔

"تم جنگ کرو کیونکہ جنگ کرتے ہوئے مرو گے تو جنت

ملے گی" (گیتا ۲-۳۷)

"جنگ نہ کرنے پر بدنامی ملے گی جس سے پوری نسل جہنم میں چلی جائے گی" (گیتا ۴۲-۱)

وید، برہمن گرنتھ، اپنیشد، رامائن اور پران میں مختلف مقامات پر دوسری دنیا کا ذکر آیا ہے جس طرح دنیا کی ساری مذہبی کتابوں میں آخرت کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح ہندو مذہبی کتابوں میں بھی آخرت کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ آواگون کا نظریہ بعد کی پیداوار ہے۔ ویدوں میں نہ صرف آخرت کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ دوزخ اور جنت کا بھی تفصیلی ذکر موجود ہے۔ اور یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ دوزخ اور جنت کی زندگی ہمیشگی کی زندگی ہے۔ اس کی بھی تفصیل موجود ہے کہ کن کاموں کے کرنے سے انسان جنت کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اور کن کاموں کی وجہ سے دوزخ میں ڈال دیا جاتا ہے۔

آخرت کا نظریہ ہر مذہب کا بنیادی نظریہ ہے لیکن قدیم مذہبی کتابوں میں سب سے پہلے اسی کو بگاڑنے اور اس کو بے اثر کرنے کی کوشش کی گئی ___ کہیں آواگون کا نظریہ پیش کر کے اس کو بالکل ہی ختم کر دیا اور کہیں سفارش اور کفارہ کا نظریہ پیش کر کے اس کو بالکل ہی بے اثر کر دیا ___ اتنے اہم مسئلہ کے بارے میں کس قدر لاپرواہی کا رویہ برتا گیا، جس کے نہایت خطرناک نتائج برآمد ہوئے اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے کافی غور و فکر ضروری تھا۔ جیسا کہ مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں:-

"انسانی زندگی کے ماحول اور انجام کے بارے میں لوگوں کے مختلف اور متضاد عقیدے خود اس بات کا صریح ثبوت

ہیں کہ ان میں سے کوئی عقیدہ بھی علم پر مبنی نہیں ہے بلکہ ہر ایک
نے قیاسات دوڑا کر اپنی جگہ جو نظریہ قائم کر لیا اس کو وہ
اپنا عقیدہ بنا کر بیٹھ گیا۔ کسی نے سمجھا کہ "زندگی بعد موت"
نہیں ہوگی۔ کسی نے اس کو مانا تو تناسخ کی شکل میں مانا۔ کسی نے
حیات اخروی اور جزا و سزا کو تسلیم کر لیا۔ تو جزائے اعمال سے
بچنے کے لیے طرح طرح کے سہارے تجویز کر لیے۔ اتنے بڑے
اور اہم ترین بنیادی مسئلے پر جس کے بارے میں آدمی کی
رائے کا غلط ہونا۔ اس کی پوری زندگی کو غلط کر کے رکھ دیتا
ہے اور ہمیشہ ہمیش کے لیے اس کے مستقبل کو برباد کر ڈالتا
ہے، علم کے بغیر محض قیاس کی بنا پر کوئی عقیدہ بنا لینا ایک
تباہ کن حماقت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی ایک بہت
بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہ کر ساری عمر جاہلانہ غفلت میں
گزار دے اور مرنے کے بعد اچانک ایک ایسی صورتحال
سے دوچار ہو۔ جس کے لیے اس نے قطعاً کوئی تیاری نہ
کی تھی۔ ایسے مسئلے کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کا
بس ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ انسان کو آخرت
کے متعلق جو علم خدا کی طرف سے اس کا نبی دے رہا ہے
اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے۔

(تفہیم القرآن جلد ۵ صفحہ ۱۳۰)

قرآن نے نہ صرف عقیدۂ آخرت کی تصدیق کی بلکہ پورے اعتماد کے ساتھ
کہا کہ آخرت آئے گی اور ضرور آئے گی چنانچہ سورہ ق میں ایک جگہ تشریح

کرتے ہوئے مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

"تم چاہے آخرت کو مانو یا اس کا انکار کردو بہرحال اس کو آنا ہے اور یہ ایک امر واقعہ ہے جو تمہارے انکار کے باوجود پیش آکر رہے گا انبیاء کی پیشگی تنبیہہ کو مان کر اس وقت کے لیے پہلے سے تیاری کر لو گے تو اپنا بھلا کرو گے نہ مانو گے تو خود ہی اپنی شامت بلاؤ گے تمہارے نہ ماننے سے آخرت آتے آتے رک نہیں جائے گی اور خدا کا قانونِ عدل معطل نہ ہو جائے گا۔ (تفہیم القرآن سورہ ق حاشیہ ۱۹)

منکرینِ آخرت کی نامعقولیت کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے جس کی تشریح میں مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

"کسی منکرینِ آخرت کے پاس نہ پہلے جاننے کا کوئی ذریعہ تھا نہ آج ہے اور نہ کبھی ہو سکتا ہے کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے لیکن ان نادانوں نے ہمیشہ بڑے زور کے ساتھ یہی دعویٰ کیا ہے۔ حالانکہ قطعیت کے ساتھ آخرت کا انکار کر دینے کے لیے کوئی بنیادی عقلی بنیاد موجود نہیں ہے، نہ علمی بنیاد۔ (تفہیم القرآن سورہ الناس حاشیہ ۱۴)

جہاں تک دلائل کا سوال ہے۔ آخرت کے حق میں دلائل خواہ کتنے ہی مضبوط کیوں نہ ہوں۔ زیادہ سے زیادہ یہی فائدہ ہو سکتا ہے کہ آخرت کے نہ ہونے کی بنسبت اس کا ہونا زیادہ معقول اور اغلب ہے۔ جیسا کہ مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

"نبی کا مقام ایک فلسفی سے بالاتر ہے۔ بلکہ اس کی اصل حیثیت

یہ ہے کہ وہ اس بات کا علم رکھتا ہے کہ آخرت ہو گی اور یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ وہ ضرور ہو کر رہے گی اِس کے لیے ایک نبی ہی قسم کھا کر یہ بات کہہ سکتا ہے۔ ایک فلسفی اس پر قسم نہیں کھا سکتا۔ اور آخرت پر ایمان ایک نبی کے بیان سے ہی ہو سکتا ہے۔ فلسفی کا استدلال اپنے اندر یہ قوت نہیں رکھتا کہ دوسرا شخص تو در کنار فلسفی خود بھی اپنی دلیل کی بنا پر اسے اپنا ایمانی عقیدہ بنا سکے۔ فلسفی اگر واقعی صحیح الفکر فلسفی ہو تو وہ "ہونا چاہیے" سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور "ہے اور یقیناً ہے" کہنا صرف ایک نبی کا کام ہے"۔

(تفہیم القرآن سورہ الذاریات حاشیہ ۴)

جہاں آخرت سارے مذاہب کا ایک بنیادی عقیدہ ہے وہیں سائنسدانوں کے نزدیک سب سے زیادہ نامعقول بھی ہے۔ اور سائنسدانوں کے مذاق کا سب سے زیادہ نشانہ یہی عقیدہ رہا ہے۔ کیونکہ سائنس نے ہر اس چیز کو ماننے سے انکار کر دیا تھا جو ان کے مشاہدہ میں نہ آسکے۔ اور چونکہ آخرت ان کے مشاہدہ میں نہیں آ رہی تھی اس لیے ان کے یہاں اس کے تسلیم کرنے کا سوال ہی نہیں تھا —— اب حالات بدل گئے ہیں سائنسدانوں کے زاویۂ نظر میں بڑی تبدیلی آچکی ہے۔ ڈیڑھ ہزار برس قبل قرآن نے کہا تھا۔

(ہم نے ہر چیز کو جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے) آج سائنس اس حقیقت کو تسلیم کر چکی ہے سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ ہر چیز اپنا ایک ضد (an:i) رکھتی ہے۔ خود اس کا وجود اس اینٹی (ANTI) کے بغیر ناممکن ہے۔

سنہ ۱۹۳۲ء میں (K. Anderson) نے کاسمک ریز (Cosmic Rays) کے اندر (Anti electron) (الیکٹران کی ضد) کا پتہ لگایا اور اس کا نام پازیٹران (Positron) رکھا یہ پہلا اینٹی پارٹیکل (Anti particle) تھا جو انسانی علوم میں آیا۔ آج ایک ایٹم کے اندر ۳۵ سے بھی زائد پارٹیکل (Particles) کا پتہ لگایا جا چکا ہے۔ اور ایٹم کے ہر پارٹیکل (particle) کا ایک اینٹی پارٹیکل (Antipar ticle) بھی ہوتا ہے۔ اس طرح انٹی پارٹیکل کو تسلیم کرتے ہی فطرتاً سائنسدانوں کی توجہ اینٹی نیوکلیس (Anti Nucleus) اور اینٹی ایٹم کی طرف مڑ گئی۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں ڈیراک (Dirac) نے اپنی ایک تقریر میں اینٹی ورلڈ (Anti world) کے امکان کا ذکر کیا تھا اور اس طرح اینٹی مٹر (Anti Matter) اور اینٹی ورلڈ کی بات چل پڑی۔ چونکہ ہر چیز اپنا ایک اینٹی (ضد) رکھتی ہے اس لیے دنیا کا بھی ایک اینٹی (ضد) ہونا چاہیے۔ آج سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اینٹی ورلڈ (Anti World) ہماری دنیا کے متوازی ایک حقیقی وجود رکھتی ہے اور ڈیراک (Dirac) کے نظریہ کے مطابق ایک اینٹی ورلڈ کا وجود ضروری ہے۔

ڈاکٹر نان (Dr. Naan) کا خیال ہے کہ اینٹی ورلڈ کا بیان طبعی سائنس (Physical science) کے اصولوں اور بنیادوں پر نہیں کیا جا سکتا۔ ان کو یقین ہے کہ وہ دنیا آج بھی موجود ہے لیکن ہم سے آزاد اور ہماری دنیا کے متوازی اپنا وجود رکھتی ہے۔

J.S. Haldane کا کہنا ہے:۔

"اس بات کے ماننے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہے کہ اس

طبعی کائنات کے پیچھے ایک اور دنیا ہے۔"

(Philosophical Basis of Biodogy

Page 38)

(Max plank) نے اپنی کتاب ۔ (Univers in the Light of Modern Physics میں لکھا ہے۔

"اس مشاہدہ کی دنیا کے علاوہ ایک حقیقی دنیا بھی ہے جو انسان کے علم اور تصورات کے ماتحت نہیں ہے۔"

A.S.Addingt on نے بھی اسی قسم کا خیال اپنی کتاب (Science and the unseen world) کے صفحہ ۳۳ پر ظاہر کیا ہے۔ سائنسدانوں کے خیالات صاف تبلا رہے ہیں کہ انھوں نے نہ صرف آخرت کو تسلیم کر لیا ہے بلکہ انھیں پورا یقین ہے کہ وہ آخرت آج بھی موجود ہے۔ وہاں کے حالات یہاں کے حالات کی ضد ہیں۔ یہاں کی ہر چیز عارضی ہے اور وہاں کی ہر چیز مستقل۔ یہاں کی ہر چیز بے قرار (Unst able) ہے جبکہ دوسری دنیا کی ہر چیز کو قرار (Stable) ہے۔ سائنسدانوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ممکن ہے کہ دوسری دنیا کی روشنی ہم تک برابر پہونچ رہی ہو۔ لیکن چونکہ دونوں روشنیوں کو ہم اب تک الگ نہیں کر سکے ہیں اس لیے وہ دوسری دنیا ہم کو دکھلائی نہیں دیتی۔ دوسری دنیا کے جاننے ہیں نیوٹرانیو (Neutrino) سے مدد مل سکتی ہے۔ لیکن نیوٹران اور اینٹی نیوٹرینو کو ایک لمحہ کے لیے بھی قرار نہیں ہے۔ اس لیے ان کا پکڑ لینا ذرا مشکل ہے۔ بہر حال اب آخرت کا تصور کوئی غیر سائنسی تصور نہیں رہا۔

آخرت کا عقیدہ سارے مذاہب کا بنیادی عقیدہ ہے۔ سائنسی

دنیا بھی اس کو تسلیم کر چکی ہے۔ پھر بھی جب انسان یہ سوچتا ہے کہ جب آدمی مر گیا، اس کا گوشت اور چمڑہ سڑ گل گیا۔ کچھ پانی بن کر بہہ گیا۔ کچھ گیسوں میں تبدیل ہو کر ہوا میں مل گیا۔ ہڈی تک بوسیدہ ہو کر زمین میں مل گئی تو وہی شخص دوبارہ معہ اپنے جسم کے کیسے زندہ کیا جائے گا؟ ـــ ذہن کسی طرح اس کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہ آج کوئی نئی بات نہیں ہے ہر دور میں سب سے زیادہ اچنبھا اس نظریہ پر ہوا ہے اور لوگوں نے صاف کہہ دیا کہ یہ تو ایک انہونی بات ہے۔ اس لیے بار بار سوال اٹھتا ہے کہ کیا آخرت ممکن بھی ہے؟ چنانچہ اس کے جواب میں قرآن کہتا ہے:۔

"کیا ہم پہلی بار تخلیق سے عاجز تھے؟ مگر ایک نئی تخلیق کی طرف سے یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں۔"

(سورہ ق آیت ۱۵)

اسی کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

"جو شخص خدا کا منکر نہ ہو اور حماقت کی اِس حد تک نہ پہنچ گیا ہو کہ اس منظم کائنات اور اس کے اندر انسان کی پیدائش کو محض ایک اتفاقی حادثہ قرار دینے لگے۔ اس کے لیے یہ مانے بغیر چارہ نہیں ہے کہ خدا ہی نے ہمیں اور اس پوری کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اب یہ امر واقعہ کہ ہم اس دنیا میں زندہ موجود ہیں اور زمین و آسمان کا یہ سارا کارخانہ ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے، آپ ہی اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ خدا ہمیں اور اس کائنات کو پیدا کرنے سے عاجز نہ تھا۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ قیامت

برپا کرنے کے بعد وہی خدا ایک دوسرا نظامِ عالم نہ بنا سکے گا اور موت کے بعد وہ ہمیں دوبارہ پیدا نہ کر سکے گا، تو وہ محض ایک خلافِ عقل بات کہتا ہے۔ خدا عاجز ہوتا تو پہلے ہی پیدا نہ کر سکتا۔ جب وہ پہلے پیدا کر چکا اور اسی تخلیق کی بدولت ہم خود وجود میں آئے بیٹھے ہیں۔ تو یہ فرض کر لینے کے لیے آخر کیا معقول بنیاد ہو سکتی ہے کہ اپنی ہی بنائی ہوئی چیز کو توڑ کر پھر بنا دینے سے وہ عاجز ہو جائے گا۔"

(تفہیم القرآن سورہ ق حاشیہ ۱۸)

آخرت کا عقیدہ ذہن قبول کرتا ہے یا نہیں۔ یہ تو بعد کی بات ہے۔ اگر اس عقیدہ کی کوئی افادیت نہیں ہے۔ تو پھر بلاوجہ دماغ سوزی کرنے سے کیا فائدہ —— ذہن میں بار بار یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا آخرت کی ضرورت نہیں ہے؟ —— حقیقت یہ ہے کہ خدا کے سامنے جوابدہی کا عقیدہ ہی نفس کے اوپر بریک کا کام کرتا ہے۔ اور انسان کو انسان بنانے میں اس عقیدہ سے زیادہ کوئی چیز مؤثر ثابت نہ ہو سکی۔ خدا سے غفلت ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ جس شخص کے ذہن میں یہ بات تازہ ہو کہ اُسے ایک دن اپنے مالک کے سامنے اپنے سارے کارناموں کی جوابدہی کرنی ہے کبھی کسی گمراہی میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ انصاف کا بھی یہی تقاضا ہے کہ نیکی کا انعام اور بدی کی سزا ملنی چاہیے۔ لیکن حال یہ ہے کہ اس دنیا میں نہ تو نیکی کا پورا پورا اجر ملتا ہے اور نہ بدی کی پوری سزا۔ بلکہ یہاں تو اکثر معاملہ ہی الٹا ہوتا ہے۔ نیک لوگ پسے جاتے ہیں اور برے لوگ عیش کرتے ہیں۔ انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ ایک دن ایسا آنا چاہیے جب نیکوں کو ان کی نیکی کا پورا پورا

انعام ملے اور بُروں کو ان کی بدی کی پوری پوری سزا۔ یہ چیز دنیا میں تو ممکن نہیں ہے۔ یہ تو مرنے کے بعد دوسری زندگی میں ہی ممکن ہے جب پوری نوع انسانی اس دنیا میں ختم ہو جائے۔ اور تمام اوّلین و آخرین بیک وقت زندہ کرکے اکٹھا کیے جائیں۔ حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ محاسبہ دوسری زندگی میں ہو اور سب انسانوں کا ایک ساتھ ہو۔ انسان کا محاسبہ اس کے پورے کارنامۂ حیات کا ہونا چاہیے۔ اس لیے اس کا صحیح وقت وہی ہے جب سب کا کارنامۂ حیات مکمل ہو چکا ہو۔ انسان جو کچھ کرتا ہے وہ اس کے سارے اثرات و نتائج کا ذمہ دار ہے جو اس کے افعال سے دوسروں کی زندگی پر پڑتے ہیں۔ اور وہ اثرات و نتائج اس کے مرنے کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتے۔ بلکہ اس کے مرنے کے بعد مدتہائے دراز تک چلتے رہتے ہیں۔ اس لیے صحیح محاسبہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب نوع انسانی کا کارنامۂ حیات ختم ہو جائے۔ اور اوّلین و آخرین بیک وقت محاسبہ کے لیے جمع کیے جائیں۔

آخرت تو ایک ضرورت ہے۔ اس کے بغیر تو دنیا کا سارا انتظام ہی درہم برہم ہو جائے گا۔ جب یہ تصوّر انسان کے ذہن پر چھا جاتا ہے کہ کل اس کو مالک کے سامنے حاضر ہونا ہے اور اس دنیا کی پوری زندگی کا حساب دینا ہے تو اپنے حقوق کے مقابلہ میں واجبات کی ادائیگی کا زیادہ فکر مند ہو جاتا ہے جہاں کوئی بیرونی طاقت نہ بھی ہو، وہاں بھی یہ تصوّر انسان کو راہ راست پر چلنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ اِس تصور کا انکار ہی نہیں بلکہ تھوڑا سا بگاڑ بھی پوری انسانی زندگی کو درہم برہم کرکے رکھ دیتا ہے۔ اس کے بغیر تو یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ انسان اس دنیا میں انسان بن کر رہ بھی سکتا ہے۔

حضرت محمد صلعم اللہ کے آخری پیغمبر (دایشروت) اور قرآن اللہ کی

آخری کتاب ہے۔ قرآن اور سنت نے خدا کا صحیح تصور اور آخرت کا نظریہ پیش کیا اور انسان کی دنیاوی زندگی کا مقصد آخرت کی کامیابی قرار دیا۔ لیکن آخرت کا راستہ اسی دنیا سے ہو کر گزرتا ہے۔ اس لیے انسانی زندگی (فرد، معاشرہ اور ریاست) کا واضح نقشہ پیش کیا تاکہ جن کو اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی مطلوب ہو، اپنی زندگی کو اسی نقشہ پر استوار کریں۔ جب آخرت کی کامیابی زندگی کی منزل قرار پائی تو ہر شخص نے دنیاوی زندگی میں اپنی ذمہ داریوں کو مستعدی سے سنبھال لیا اور نتیجے کے طور پر ایک نمونے کا معاشرہ وجود میں آگیا۔ معاشرہ کے ہر فرد نے خواہ وہ خلیفہ ہو یا جج، سپہ سالار ہو یا معمولی سپاہی، تاجر ہو یا کسان، مالک ہو یا غلام، ہر ایک نے مثالی کردار پیش کیا جس کی تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں بھری پڑی ہیں — زندگی میں ایک دو موقعوں پر مثالی کردار پیش کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے — پوری زندگی کا کردار مثالی ہونا اسی وقت ممکن ہے۔ جب انسان اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی کی خاطر جی رہا ہو۔
